تفسیر نمونہ
(جلد دوازدہم)

یہ کتاب برقی شکل میں نشرہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

تفسیر نمونہ جلد دوازدہم

تفسیر نمونہ، آیہ اللہ العظمی مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) کی ۱۵ سالہ زحمات کا نتیجہ ہے جس کو معظم لہ نے اہل قلم کی ایک جماعت کی مدد سے فارسی زبان میں تحریر فرمایا، اس کا اردو اور عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہوچکا ہے.

تعداد جلد: ۱۵ جلد

زبان: اردو

مترجم: مولانا سید صفدر حسین نجفی (رح)

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۱۷ ھجری

سورہ بنی اسرائیل

مکہ میں نازل ہوئی

اس میں ۔ ۱۱۱ آیتیں ہیں

نام اور مقام نزول

اس کا مشہور نام "سورۂ بنی اسرائیل" ہے البتہ دیگر چند نام بھی ہیں ۔ مثلاً:

"سورۂ اسراء""سورۂ سبحان" وغیرہ[۱]

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر نام اس سورت میں موجود مطالب کے حوالے سے ہے ۔ سورۂ بنی اسرائیل اسے اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس سورت کی ابتداء اور اختتام کا ایک اچھا خاصا حصّہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے ۔

"اسراء" اسے اس کی پہلی آیت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جو رسولِ اکرم (ص) کے اسراء (یعنی معراج) کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور سورہ سبحان اسے اس کے پہلے لفظ کی وجہ سے کہتے ہیں ۔

البتہ جن روایات میں اس سورہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے ان میں اسے صرف "بنی اسرائیل" کہا گیا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اس سورہ کے لیےیہی نام انتخاب کیا ہے ۔

بہرحال مشہور یہ ہے کہ اس سورہ کی تمام آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے مفاہیم و مضامین بھی مکّی سورتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں ۔ تا ہم بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس کی کچھ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن پہلے والا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

۱۔ تفسیر آلوسی ج ۱۵ ص ۲۔

فضیلت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام صادق علیہ السلام سے اس سورت کی تلاوت کرنے والے کے لیے بہت زیادہ اجر و ثواب منقول ہے۔ ان روایات میں سے ایک کہ جو امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس میں آپ (ع) فرماتے ہیں: من قرء سورة بنی اسرائیل فی کل لیلة جمعة لم یمت حتّی یدرک القائم و یکون من اصحابه

جو شخص ہر شبِ جمعہ سورہ بنی اسرائیل کی تلاوت کرے گا وہ اس وقت تک دنیا سے نہ جائے گا جب تک "قائم (ع)" کو نہ دیکھ لے اور وہ آپ کے یارو انصار میں سے ہوگا۔

ہم نے بارہا اس امر کا تکرار کیا ہے کہ قرآن پاک کی سورتوں کا جو اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے وہ ہرگز صرف زبانی پڑھ لینے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان روایات میں پڑھنے سے مراد ایسا پڑھنا ہے کہ جس میں غور و فکر اور سوچ بچار شامل ہوا اور اس کے نتیجے میں انسان اس قرات اور فکر کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی کرے۔

خصوصاً اسی سورہ کی فضیلت سے مربوط ایک روایت میں ہے: فرّق قلبه عند ذکر الوالدین

اس سورہ کا قاری جب اس میں اللہ کی نصیحتوں تک پہنچتا ہے تو اس کے احساسات میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور ماں باپ سے محبت کا جذبہ اس میں فزوں تر ہوجاتا ہے۔

لہٰذا وہ شخص ایسے اجر کا حامل ٹھہرتا ہے۔

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ قرآنی الفاظ محترم اور اہم ہیں لیکن یہ الفاظ تمہید ہیں معانی و مفاہیم کے لیے اور معانی مقدمہ ہیں عمل کے لیے۔

مضامین ایک نگاہ میں

ہم کہہ چکے ہیں، جیسا کہ مشہور ہے یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی، لہٰذا فطری امر ہے کہ اس میں مکی سورتوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ ان میں دعوت توحید بھی ہے، معاد کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے، مفید نصیحتیں بھی ہیں اور شرک، ظلم، انحراف اور کج روی کے خلاف بھی اس میں بہت سارا مواد ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مجموعی طور پر اس سورت کی آیتیں ان امور پر مشتمل ہیں:

۱۔ نبوت کے دلائل۔ بالخصوص قرآن اور معراج کے حوالے سے۔

۲۔ معاد سے مربوط بحثیں۔ انجام کار، اجر و ثواب، نامہ اعمال اور اس کے نتائج۔

۳۔ سورہ کے آغاز اور اختتام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصّہ۔

۴۔ ارادہ و اختیار کی آزادی ۔ اور یہ کہ ہر قسم کے اچھے برے عمل کا نتیجہ خود انسان کو بھگتنا پڑتا ہے ۔

۵۔ اس جہان کی زندگی کا حساب کتاب دوسرے جہان کے لیے نمونہ ہے ۔

۶۔ ہر سطح پر حق شناسی ۔ خصوصاً اعزاء و اقرباء کے بارے میں اور ان میں سے بھی خاص طور پر ماں باپ کے بارے میں ۔

۷۔ فضول خرچی، کنجوسی، اولاد کشی، زناء، مالِ یتیم کھانا، کم فروشی، تکبر اور خونریزی سب حرام ہیں ۔

۸۔ توحید اور خداشناسی سے متعلق مباحث۔

۹۔ پیش حق ہر قسم کی ہٹ دھرمی کے خلاف مقابلہ اور یہ کہ گناہ انسان اور چہرہ حق کے درمیان پردہ ڈال دیتے ہیں ۔

۱۰۔ انسان کا مقام اور دوسری مخلوقات پر اس کی فضیلت۔

۱۱۔ ہر قسم کی اخلاقی اور اجتماعی بیماری کے علاج کے لیے تاثیر قرآن۔

۱۲۔ اعجازِ قرآن اور اس کے مقابلے کی عدم توانائی ۔

۱۳۔ شیطانی وسوسے اور ان کے خلاف مومنین کو تنبیہ۔

۱۴۔ مختلف اخلاقی تعلیمات۔

۱۵۔ تاریخ انبیاء کے بعض نشیب و فراز۔ تمام انسان کے لیے عبرت کے درس۔

بہر حال مجموعی طور پر عقائد، اخلاق اور معاشرت کے حوالے سے راہنمائی پر مبنی یہ ایک جامع اور کامل سورت ہے اور یہ مختلف میدانوں میں انسان کے ارتقاء و کمال کا زینہ بن سکتی ہے ۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ یہ سورت تسبیح خدا سے شروع ہوتی ہے اس کی حمد و تکبیر پر تمام ہوتی ہے ۔ تسبیح نشانی ہے ہر قسم کے عیب و نقص سے دوری اور پاک رہنے کی اور حمد و ثنا نشانی ہے صفاتِ فضیلت سے آراستہ ہونے کے لیے اور تکبیر کمال و عظمت کی طرف بڑھنے کے لیے علامت ہے ۔

آیت ۱

﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

۱ ﴿سُبْحَانَ الَّذِی أَسْرٰی بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصَی الَّذِی بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّه هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾

ترجمہ

بخشنے والے مہربان اللہ کے نام سے

۱۔ پاک و منزل ہے وہ اللہ کہ جو اپنے بندے کو رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا کہ جس کا ماحول پر برکت ہے، تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں۔یقینا وہ سننے والا ہے۔

معراجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس سورت کی پہلی آیت میں "اسراء" کا ذکر ہے۔راتوں رات جو رسول اللہ نے مسجد الحرام سے مسجدالاقصیٰ(بیت المقدس)کا سفر کیا تھا اس میں اس کا ذکر ہے۔یہ سفر معراج کا مقدمہ بنا۔یہ سفر جو رات کے بہت کم وقت میں مکمل ہوگیا کم ازکم اس زمانے کے حالات،راستوں اور معمولات کے لحاظ سے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔یہ بالکل اعجاز آمیز اور غیر معمولی تھا۔

پہلے فرمایا گیا ہے:منزہ ہے وہ خدا کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدالحرام سے مسجدالاقصیٰ کی طرف لے گیا ﴿سُبْحَانَ الَّذِی أَسْرٰی بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصَی﴾۔

رات کی یہ غیر معمولی سیر اس لیے تھی تاکہ ہم اسے اپنی عظمت کی نشانیاں دکھائیں ﴿لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا﴾۔

آخر آیت میں فرمایا گیا ہے:اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے ﴿إِنَّه هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو اس افتخار کے لیے چنا ہے تو یہ بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ رسول کی گفتار اور ان کا کردار اس قابل تھا کہ یہ لباس ان کے بدن کے لیے بالکل زیبا تھا۔

اللہ نے اپنے رسول کی گفتار سنی،اس کا کردار دیکھا اور اس مقام کے لیے اس کی لیاقت مان لی۔

اس جملے کے بارے میں بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس اعجاز کے منکرین کو تہدید کی جائے کہ اللہ ان کی باتیں سنتاہے،ای کے اعمال دیکھتا ہے اور ان کی سازش سے آگاہ ہے۔

یہ آیت نہایت مختصر اور جچے تلے الفاظ پر مشتمل ہے تاہم اس رات کے معجزہ نما سفر کے بہت سے پہلو اس آیت سے واضح ہوجاتے ہیں :

(۱) لفظ "اسریٰ" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سفررات کے وقت ہوا کیونکہ "اسراء" عربی زبان میں رات کے سفر کے معنی ہے جبکہ لفظ "سیر" دن کے سفر کے لیے بولا جاتا ہے ۔

(۲) لفظ "لیلا" ایک تو "اسرا" کے مفہوم کی تاکید ہے اور دوسرے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ سارے کا سارا سفر ایک ہی رات میں ہوا اور اہم بات بھی یہی ہے کہ مسجد الحرام اور مسجد الاقصیٰ کے درمیان ایک سوفرسخ سے زیادہ کا فاصلہ کئی دنوں بلکہ کئی ہفتوں میں طے کیا جاتا تھا جبکہ شب اسراء تھوڑے سے وقت میں یہ سفر مکمل ہوگیا ۔

(۳) لفظ "عبد" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ افتخار و اکرام رسول اللہ کے مقام عبودیت کی وجہ سے تھا کیونکہ انسان کے لیے سب سے بلند منزل یہی ہے کہ وہ اللہ کا سچا اور صحیح بندہ ہوجائے ۔ اس کی بارگاہ کے سوا کہیں تھا نہ جھکائے، اس کے علاوہ کسی کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے، جو بھی کام کرے فقط خدا کے لیے ہو اور جو بھی قدم اٹھائے اسی کی رضا مطلوب ہو۔

(۴) "عبد" کی تعبیر یہ واضع کرتی ہے کہ سفر عالم بیداری میں تھا اور یہ جسمانی سیر تھی نہ کہ روحانی کیونکہ سیر روحانی کا کوئی معقول معنی خواب یا خواب کی مانند حالت کے سوا نہیں ہے لیکن لفظ "عبد" نشاندہی کرتا ہے کہ جسم و روح پیغمبر اس سفر میں شریک تھے ۔ یہ اعجاز جن میں نہیں آتا انہوں نے جو زیادہ بات کی ہے یہ ہے کہ انہوں نے آیت کی توجیہ کے نام پر اسے روحانی کہہ دیا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں فلاں شخص کو فلاں جگہ سے لے گیا تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہوگا کہ عالم خواب میں یا عالم خیال میں یا فکری طور پر لے گیا ۔

(۵) اس سفر کا آغاز مکہ کی مسجد الحرام سے وہاں سے بیت المقدس میں موجود مسجد الاقصیٰ پہنچے (اور یہ سفر معراج آسمانی کا مقدمہ تھا کہ جس کے بارے میں ہم بعد میں دلایل پیش کریں گے) ۔

البتہ تمام مکہ کو بھی چونکہ ااحترام کی وجہ سے مسجد الحرام کہا جاتا ہے لہذا مفسرین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ رسول اللہ کا یہ سفر خانہ کعبہ کے قریب سے شروع ہوا تھا یا کسی عزیز رشتہ دار کے گھر سے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ سیر خانہ کعبہ سے شروع ہوئی ۔

(٦)اس سیر کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ عظمت الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں ۔آسمانوں کی سیر بھی اسی مقصد سے تھی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی با عظمت روح ان آیات بینات ما مشاہدہ کرکے اور بھی عظمت و بزرگی پالے اور انسانوں کی ہدایت کے لیے آپ خوب تیار ہوجائیں ۔یہ سفر معراج بعض کوتاہ فکر لوگوں کے خیال کے بر عکس اس لیے نہ تھا کہ آپ خدا کو دیکھیں ۔ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خدا آسمانوں میں رہتا ہے ۔

بہر حال اگرچہ رسول اللہ عظمت الٰہی کو پہچانتے تھے اور اس کی خلقت کی عظمت سے بھی آگاہ تھے لیکن بقولے:ولی شنیدن کی بود مانند دیدن

سورہ نجم کی آیات میں بھی اس سفر کے آخری حصے یعنی معراج آسمانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے:﴿لَقَد رَاٰی مِن اٰیَاتِ رَبِّهِ الکُبرٰی﴾

اس سفر میں اس نے اپنے رب کی عظیم آیات دیکھیں ۔

(٧)"بارکنا حولہ "یہ مطلب واضح کرتا ہے کہ مسجد الاقصیٰ علاوہ اس کے کہ خود مقدس ہے اس کے اطراف کی سرزمین بھی مبارک اور با برکت ہے ۔یہ اس کی ظاہری برکات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ سر سبز و شاداب سرزمین ہے ۔درخت اس زمین پر سایہ فگن ہیں ۔پانی وہاں جاری رہتا ہے اور یہ ایک آباد علاقہ ہے ۔

(٨)جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "اِنَّہ ھُوَا لسَّمِیعُ الْبَصِیر"کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسولاللہ کو اس نعمت کی عطا بلا وجہ نہ بلکہ اس اہلیت و لیاقت کے باعث تھی کہ جو آپ کی گفتار و کردار سے ہویدا تھی اور اللہ ہر عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے ۔

(٩) ضمنی طور پر لفظ "سبحان "اس بات کی دلیل ہے اور رسول اللہ کا یہ سفربذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہر عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے ۔

(١٠)"من اٰیاتنا"میں لفظ "من"نشاندہی کرتا ہے کہ آیات عظمت الٰہی اس قدر زیادہ ہیں کہ اپنی تمام تر عظمت کے با وجود رسول اللہ (ص) نے اس با عظمت سفر میں صرف بعض کا ہی مشاہدہ کیا ۔

مسئلہ معراج

علماء اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ رسول اکرم (ص) جس وقت مکہ میں تھے تو ایک ہی رات میں آپقدرت الٰہی سے مسجد الحرام سے مسجد المقدس میں ہے ۔ وہاں سے آپ آسمانوں کی طرف گئے آسمانی وسعتوں میں عظمت الٰہی کے آثار مشاہدہ کیے اور اسی رات مکہ واپس آ گئے ۔

نیز یہ بھی مشہور ہے کہ یہ زمینی اور آسمانی سیر جسم اور روح کے ساتھ تھی البتہ یہ سیر چونکہ بہت عجیب و غریب اور بے نظیر تھی لہذا بعض حضرات نے اس کی توجیہ کی اور اسے معراج روحانی قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک طرح کا خواب تھا یا مکاشفہ روحی تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بات آیات کے ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ظاہرِ آیات اس معراج کے جسمانی ہونے کی گواہی دتا ہے ۔

بہر حال اس بحث سے بہت سے سوالات پیدا پیدا ہوتے ہیو مثلاً:

۱ ۔ قرآن، حدیث اور تاریخ کی نظر سے معراج کی کیفیت کیا تھی؟

۲ ۔ شیعہ اور سنی علماء اسلام کا اس سلسلے میں کیا عقیدہ ہے؟

۳ ۔ معراج کا مقصد کیا تھا؟

۴ ۔ دور حاضر کے علم اور سائنس کی رو سے معراج کا کیا امکان ہے؟

ان تمام مسائل کا لماحقہ، جائزہ پیش کرنا اگرچہ تفسیر کی حدود سے باہر ہے تاکہ ہم کوشش کریں گے کہ مختصراً ان تمام مسائل کو قارئین محترم کے سامنے ذکر کریں ۔

۱ ۔ معراج ۔ قرآن و حدیث کی نظر میں:

قرآن حکیم کی دو سورتوں میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ پہلی سورت ۔ یہی سورہ بنی اسرائیل ہے ۔ اس میں اس سفر کے ابتدائی حصے کا تذکرہ ہے ۔ یعنی مکہ کی مسجد الحرام سے بیت المقدس کی مسجدِ الاقصیٰ تک کا سفر ۔

اس سلسلے کی دوسری سورت ۔ سورۂ نجم ہے ۔ اس کی آیت ۱۳ تا ۱۸ میں معراج کا دوسرا حصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ آسمانی سیر کے متعلق ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے:-

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخرى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهى عِنْدَها جَنَّةُ الْمَأْوى إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ ما يَغْشى ما زاغَ الْبَصَرُ وَما طَغى لَقَدْ رَأى مِنْ آياتِ رَبِّهِ الْكُبْرى﴾

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ۔

رسول اللہ نے فرشتہ وحی جبریل کو اس کی اصل صورت میں دوسری مرتبہ دیکھا (پہلے آپ اسے نزول وحی کے آغاز میں کوہِ حرا میں دیکھ چکے تھے) یہ ملاقات بہشت جاوداں کے پاس ہوئی ۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے رسول اللہ کسی اشتباہ کا شکار نہ تھے ۔ آپ نے عظمت الٰہی کی عظیم نشانیاں مشاہدہ کیں ۔

یہ آیات کہ جو اکثر مفسرین کے بقول واقعہ معراج سے متعلق ہیں یہ بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں پیش خصوصاً "مازاغ البصر و ماطغیٰ" اس امر کا شاہد ہے کہ رسول اللہ کی آنکھ کسی خطا، اشتباہ اور انحراف سے دوچار نہیں ہوئی ۔

اس واقعے کے سلسلے میں مشہور اسلامی کتابوں میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں ۔

علماء اسلام نے ان روایات کے تواتر اور شہرت کی گواہی دی ہے ۔ ہم نونے کے طور پر چند روایات ذکر کرتے ہیں :

۱۔ عظیم فقیہ و مفسر شیخ طوسی تفسیر تبیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں کہتے ہیں :

شیعہ علما کا مؤقف ہے کہ جس رات اللہ اپنے رسول کو مکہ سے بیت المقدس لے گیا اسی رات اس نے آپ کو آسمانوں کی طرف بلند کیا اور آپ کو اپنی عظمت کی نشانیاں دکھائیں اور یہ سب کچھ عالم بیداری میں تھا، خواب میں نہ تھا ۔

۲۔ بلند مرتبہ مفسر مرحوم طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان میں سورہ نجم کی آیات کے ذیل میں کہتے ہیں :

ہماری روایات میں مشہور یہ ہے کہ اللہ اپنے رسول کو اسی جسم کے ساتھ عالم بیداری و حیات میں آسمانوں پر لے گیا اور اکثر مفسرین کا یہی عقیدہ ہے ۔

۳۔ مشہور محدث علامہ مجلسی بحار الانوار میں کہتے ہیں :

مسجد الحرام سے بیت المقدس کی طرف اور وہاں سے آسمانوں کی طرف رسول اسلام کی سیر ایسی بات ہے جس پر آیات قرآن اور شیعہ و سنی متواتر احادیث دلالت کرتی ہیں ۔ اس کا انکار یا اسے روحانی معراج کہنا یا عالم خواب کی بات قرار دینا ۔ آئمہ ہدیٰ (ع) کی احادیث سے عدم اطلاع یا یقین کی کمزوری کے باعث ہے ۔

اس کے بعد علامہ مجلسی مزید کہتے ہیں :

اگر ہم اس واقعے سے متعلقہ احادیث جمع کرنا چاہیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائیگی ۔[1]

۴۔ اہل سنت کے معاصر علماء میں سے الا زہر کے منصور علی ناصف مشہور کتاب "التاج" کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اس میں احادیث معراج کو جمع کیا ہے۔

۵۔ مشہور فسر فخر الدین رازی نے زیر بحث آیت کے ذیل میں واقعہ معراج کے امکان پر بہت سی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ دلائل ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں:

حدیث کے لحاظ سے احادیث معراج مشہور روایات میں سے عیں کہ جو اہل سنت کی کتب صحاح میں نقل ہوئی ہیں اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کی۔

۶۔ شیخ عبد العزیز بن عبداللہ بن باز ادارہ "بحوث علمیہ و افتاء و دعوۃ و ارشاد" کے سر براہ ہیں وہ دور حاضر کے متعصب وہابی علماء میں سے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "التحذیر من البدع" میں کہتے ہیں:

اس میں شک نہیں ہے کہ معراج ان عظیم نشانیوں میں سے ہے جو رسول کی صداقت اور بلند منزلت پر دلالت کرتی ہیں۔

یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں:

رسول اللہ سے اخبار متواتر نقل ہوئی ہیں کہ اللہ انہیں آسمانوں پر لے گیا اور آپ پر آسمانوں کے دروازے کھول دیئے۔[۲]

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ احادیث معراج میں بعض جعلی یا ضعیف ہیں کہ جو کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں ہیےیہی وجہ ہے کہ عظیم مفسر طبرسی مرحوم نے اسی زیر بحث آیت کے ذیل میں لحادیث معراج کو ان چار قسموں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) وہ روایات جو متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہیں مثلاً اصل واقعہ معراج۔

(۲) وہ احادیث کہ عقلی لحاظ سے جنہیں قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں اور روایات میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے۔ مثلاً صحن آسمان میں عظمتِ الٰہی کی بہت سی نشانیوں کا مشاہدہ کرنا۔

(۳) وہ روایات جد ہمارے ہاں موجود اصول و ضوابط پر تو پوری نہیں اترتیں البتہ ان کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً وہ احادیث جو کہتی ہیں کہ رسول اللہ نے آسمانوں میں ایک گروہ کو جنت میں اور ایک گروہ کو دوزخ میں ددیکھا۔ کہنا چاہیئے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کی صفات دیکھیں (یا برزخ کی جنت اور دوزخ کی)۔

(۴)وہ روایات جو نا معقول اور باطل امور پر مشتمل ہیں اور ان کی کیفیت ان کے جعلی ہونے پر گواہ ہے۔ مثلاً وہ روایات جو کہتی ہیں کہ رسول اللہ نے خدا کو واضح طور پر دیکھا، اس کے ساتھ باتیں کیں اور اس کے پاس بیٹھے۔ ایسی احادیث کسی دلیل و منطق کے لحاظ سے درست نہیں ہیں اور بلاشبہ اس قسم کی روایات من گھڑت اور جعلی ہیں۔

واقعہ معراج کی تاریخ کے سلسلے میں اسلامی مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ بعثت کے دسویں سال ۲۷ رجب کی شب پیش آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بعثت کے بارہوں سال ۱۷ رمضان المبارک کی رات وقوع پذیر ہوا جبکہ بعض اسے اوائل بعثت میں میں ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کی تاریخ میں اختلاف اصل واقعہ پر اختلاف میں حائل نہیں ہوتا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صرف مسلمان ہی معراج کا عقیدہ نہیں رکھتے، دیگر ادیان کے پیروکاروں میں بھی یہ عقیدہ کم و بیش موجود ہے۔ ان میں سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ عجیب تر صورت نظر آتا ہے جیسا کہ انجیل مرقس کے باب ۶، لوتا کے باب ۲۴ اور یوحنا کے باب ۲۱ میں ہے کہ:

عیسیٰ مصلوب ہونے کے بعد دفن ہوگئے تو مُردوں میں سے اٹھ کھڑے ہونے اور چالیس روز تک لوگوں میں موجود ہے پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے (اور ہمیشہ کے لیے معراج پر چلے گئے)۔

ضمناً یہ وضاحت بھی ہوجائے کہ بعض اسلامی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض گذشتہ انبیاء کو بھی معراج نصیب ہوئی تھی۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی؟

شیعہ اور سنی علمائے اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں صورت پذیر ہوا۔

سوورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی موذکرہ آیات کا مظاہری مفہوم بھی اس امر کا شاہد ہے کہ یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا۔

تواریخ اسلامی بھی اس امر پر شاہد صادق ہیں۔ تاریخ کہتی ہے:

جس دقت رسول اللہ نے واقعہ معراج کا ذکر کیا تو مشرکین نے شدت سے اس کا انکار کردیا اور اسے آپ کے خلاف ایک بات بنا لیا۔

یہ بات گواہی دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز خواب یا مکاشفہ روحانی کے مدعی نہ تھے ورنہ مخالفین اس قدر شور و غوغا نہ کرتے۔

یہ جو حسن بصری سے روایت ہے کہ: کان فی المنام رؤیاً راٰھا

یہ واقعہ خواب میں پیش آیا۔

اور اسی طرح جو حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ: واللہ ما فقد جسد رسول اللہ و لکن عرج بروحہ

خدا کی قسم بدن رسول اللہ ہم سے جدا نہیں ہوا صرف آپ کی روح آسمانوں پر گئی۔

ایسی روایات ظاہراً سیاسی پہلو رکھتی ہیں۔[۳]

۱۔ بحار الانوار، ج ۶ طبع قدیم ص ۳۶۸-

۲۔ التحذیر ص ۷-

۳۔ حسن بصری اور حضرت عائشہ سے مروی روایات بذاتِ خود محل اشکال ہیں کیونکہ واقعہ معراج مکہ مکرمہ میں پیش آیا تھا۔(ثاقب)

معراج کا مقصد

گزشتہ مباحث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ معراج کا مقصد یہ نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیدار خدا کے لیے آسمانوں پر جائیں، جیسا کہ سادہ لوح افراد خیال کرتے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مغربی دانشور بھی نا آگاہی کی بناء پر دوسروں کے سامنے اسلام کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر "گیورگیو" ہیں۔ وہ اپنی کتاب "محمد وہ پیغمبر ہیں جنہیں پھر سے پہچاننا چاہیے" میں کہتے ہیں:

محمد اپنے سفر معراج میں ایسی جگہ پہنچے کہ انہیں خدا کے قلم کی آواز سنائی دی انہوں نے سمجھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حساب کتاب میں مشغول ہے البتہ وہ اللہ کے قلم کی آواز تو سنتے تھے مگر انہیں اللہ دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔(۱)

یہ عبارت نشاندہی کرتی ہے کہ قلم لکڑی کا تھا، ایسا کہ کاغذ پر لکھتے وقت لرزتا تھا اور آواز پیدا کرتا تھا۔ اسی طرح کی اور بہت ساری خرافات اس میں موجود ہیں۔

جبکہ مقصدِ معراج یہ تھا کہ اللہ کے عظیم پیغمبر کائنات میں بالخصوص عالمِ بالا میں موجود عظمت الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں اور انسانوں کی ہدایت و رہبری کے لیے ایک نیا ادراک اور نئی بصیرت حاصل کریں۔

امام صادق علیہ السلام سے مقصدِ معراج پوچھا گیا تو آپ (ع) نے فرمایا:

ان اللہ لا یوصف بمکان، ولا یجری علیہ زمان، ولکنہ عزوجل أراد أن یشرف بہ ملائکتہ و سکان سماواتہ، و یکرمھم بمشاھدتہ،و یریہ من عجائب عظمتہ ما یخبربہ بعد ھبوطہ۔

خدا ہرگز کوئی مکان نہیں رکھتا اور نہ اس پر کوئی زمانہ گزرتا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ فرشتوں اور آسمان کے باسیوں کو اپنے پیغمبر کی تشریف آوری سے عزت بخشے اور انہیں آپ کی زیارت کا شرف عطا کرے نیز آپ کو اپنی عظمت کے عجائبات دکھائے تاکہ واپس آکر آپ انہیں لوگوں سے بیان کریں۔(۲)

۱۔ مذکورہ کتاب کے فارسی ترجمہ کا نام ہے "محمد پیغمبری کہ از نو باید شناخت" ص ۱۲۵ دیکھیے۔

۲۔ تفسیر برہان، ج۲، ص۴۰۰۔

معراج اور دور حاضر کا علم اور سائنس

گزشتہ زمانے میں بعض فلاسفہ بطلیموس کی طرح یہ نظریہ رکھتے تھے کہ نو آسمان پیاز کے چھلکے کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ہیں ۔ واقعہ معراج کو قبول کرنے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہی نظریہ تھا ۔ ان کے خیال میں اس طرح تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ آسمان شگافتہ ہوگئے تھے اور پھر آپس میں مل گئے تھے ۔(۱)

لیکن بطلیموسی نظریہ ختم ہوگیا تو آسمانوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہوگیا البتہ علم ہیئت میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے معراج کے سلسلے میں نئے سوالات ابھرے ہیں مثلاً:

(۱) ایسے فضائی سفر میں پہلی رکاوٹ کشش ثقل ہے کہ جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لیے کم از کم چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے ۔

(۲)دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہوا نہیں ہے جبکہ ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا ۔

(۳) تیسری رکاوٹ ایسے سفر میں اس حصے میں سورج کی جلادینے والی تپش ہے کہ جس حصے پر سورج کی مستقیماً روشنی پڑ رہی ہے اور اس حصے میں مار ڈالنے والی سردی ہے کہ جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی ۔

(۴)اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ فضائے زمین سے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز Cosmic Rays الٹراوائلٹ ریز Ultra Violet Rays اور ایکس ریز X-Rays ۔ یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو بدن کے آرگانزم Organism کے لیے نقصان وہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں بہت تباہ کن ہوتی ہیں ۔ (زمین پر رہنے والوں کے لیے زمین کے اوپر موجود فضا کی وجہ سے ان کی تابش ختم ہوجاتی ہے) ۔

(۵) ایک اور مشکل اس سلسلے میں یہ ہے کہ خلا میں انسان بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے اگرچہ تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اگر زمین کے باسی بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلاص جا پہنچیں تو بے وزنی سے نمٹنا بہت ہی مشکل یا ناممکن ہے ۔

(٦) آخری مشکل اس سلسلے میں زمانے کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دور حاضر کے سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی شخص آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو۔

ان امور کے جواب میں ان نکات کس طرف توجہ ضروری ہے:

(۱) ہم جانتے ہیں کہ فضائی سفر کی تمام تر مشکلات کے باوجود آخر کار انسان علم کی قوت سے اس پر دسترس حاصل کرچکا ہے اور سوائے زمانے کی مشکل کے باقی تمام مشکلات حل ہوچکی ہیں اور زمانے والی مشکل بھی بہت دور کے سفر سے مربوط ہے ۔

(۲) اس میں شک نہیں کہ مسئلہ معراج عمومی اور معمولی کا پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ اللہ کی لامتناہی قدرت و طاقت کے ذریعے صورت پذیر ہوا اور انبیاء کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے، زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ معجزہ عقلاً محال نہیں ہونا چاہئے اور یہ معجزہ بھی عقلاً ممکن ہے ۔ باقی معاملات اللہ کی قدرت سے حل ہوجاتے ہیں ۔

جب انسان یہ طاقت رکھتا ہے کہ سائنسی ترقی کی بنیاد پر ایسی چیزیں بنالے کہ جو زمینی مرکز ثقل سے باہر نکل سکتی ہیں، ایسی چیزیں تیار کرلے کہ فضائے زمین سے باہر کی ہولناک شعاعیں ان پر اثر نہ کرسکیں اور مشق کے ذریعے کے ذریعے بے وزنی کی کیفیت میں رہنے کی عادت پیدا کرلے ۔ یعنی جب انسان اپنی محدود قوت کے ذریعے یہ کام کرسکتا ہے تو پھر کیا اللہ اپنی لامحدود طاقت کے ذریعے یہ کام نہیں کرسکتا؟

ہمیں یقین ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس سفر کے لیے انتہائی تیز رفتار سواری دی تھی اور اس سفر میں درپیش خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے انہیں اپنی مدد کا لباس پہنایا تھا ۔ ہاں یہ سواری کس قسم کی تھی اور اس کا نام کیا تھا ۔ براق؟ یا کوئی اور---؟ یہ مسئلہ قدرت کا راز ہے، ہمیں اس کا علم نہیں ۔

ان تمام چیزوں سے مقطع نظر تیز ترین رفتار کے بارے میں مذکورہ نظریہ آج کے سائنسدانوں کے درمیان متزلزل ہوچکا ہے اگرچہ آئن سٹائن اپنے مشہور نظریے پر پختہ یقین رکھتا ہے ۔

آج کے سائنسدان کہتے ہیں کہ امواج جاذبہ Rays of Attraction زمانے کی احتیاج کے بغیر آنِ واحد میں دنیا کی ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہوجاتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ احتمال بھی ہے کہ عالم کے پھیلاؤ سے مربوط حرکات میں ایسے منظومے موجود ہیں کہ جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے مرکز جہان سے دور

ہوجاتے ہیں (ہم جانتے ہیں کہ کائنات پھیل رہی ہے اور ستارے اور نظام ہائے شمسی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں)(غور کیجئے گا) ۔

مختصر یہ کہ اس سفر کے لیے جو بھی مشکلات بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی عقلی طور پر اس راہ میں حائل نہیں ہے اور ایسی کوئی بنیاد نہیں کہ واقعہ معراج کو محال عقلی سمجھا جائے ۔ اس راستے میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے جو وسائل درکار ہیں وہ موجود ہوں تو ایسا ہوسکتا ہے ۔

بہرحال واقعہ معراج نہ تو عقلی دلائل کے حوالے سے ناممکن ہے اور نہ دور حاضر کے سائنسی معیاروں کے لحاظ سے، البتہ اس کے غیر معمولی اور معجزہ ہونے کو سب قبول کرتے ہیں لہٰذا جب قطعی اور یقینی نقلی دلیل سے ثابت ہوجائے تو اسے قبول کرلینا چاہیے ۔[۲]

واقعہ معراج کے سلسلے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں جن پر انشاء اللہ سورہ نجم کی تفسیر میں گفتگو ہوگی ۔

۱۔ بعض قدیم فلاسفہ کا نظریہ تھا کہ آسمانوں میں ایسا ہوتا ممکن نہیں ہے ۔ اصطلاح میں وہ کہتے تھے کہ افلاک میں ''خرق'' (پھٹنا) اور ''التیام''(ملنا) ممکن نہیں ۔

۲۔ مزید وضاحت کے لیے کتاب ''ہمہ می خواہند بدانند'' کی طرف رجوع فرمائیں ۔ اس میں ہم نے معراج، شق القمر اور قطبین میں عبادت کے سلسلے میں بحث کی ہے ۔

آیات ۸،۷،۶،۵،۴،۳،۲

۲ ﴿وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلاَّ تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا﴾

۳ ﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾

۴ ﴿وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا﴾

۵ ﴿فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا﴾

۶ ﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا﴾

۷ ﴿إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا
دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا﴾

۸ ﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا﴾

ترجمہ

۲۔ ہم نے موسیٰ کو (آسمانی) کتاب عطا کی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کا ذریعہ قرار دیا اور ہم نے کہا کہ ہمارے غیر کو سہارا نہ بناؤ۔

۳۔ اے ان لوگوں کی اولاد کہ جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا! وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔

۴۔ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں بتادیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے
۔

۵۔ جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو ہم تمہارے اوپر نہایت زور آور لوگ بھیجیں گے (تاکہ وہ تم سے سختی سے نمٹیں یہاں تک کہ مجرموں کو پکڑنے کے لیے) گھروں کی تلاشی لیں گے اور یہ وعدہ قطعی ہے۔

۶۔ اس کے بعد ہم تمہیں ان پر غلبہ دیں گے اور تمہارا مال اور اولاد بڑھادیں گے اور تمہاری تعداد (دشمن سے) زیادہ کردیں گے۔

۷۔ اگر نیکی کرو گے تو اپنے آپ سے بھلائی کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو بھی خود سے کرو گے اور جب دوسرے وعدے کا وقت آپہنچا (تو دشمن تمہارا یہ حال کرے گا کہ) تمہارے چہرے غمزدہ ہوجائیں گے اور وہ مسجد (اقصیٰ) میں یوں داخل ہوں گے جیسے پہلے دشمن داخل ہوئے تھے اور جو چیز بھی ان کے ہاتھ پڑے گی اسے درہم برہم کردیں گے۔

۸۔ ہوسکتا ہے تمہارا رب تم پر رحم کرے ۔ جب تم پلٹ آوں گے تو ہم بھی پلٹ آئیں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے سخت قید خانہ بنا رکھا ہے ۔

دو عظیم طوفانی واقعات

اس سورت کی پہلی آیت میں رسول اللہ کے مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کے اعجاز آمیز سفر کا ذکر تھا ۔ ایسے واقعات کا عموماً مشرکین اور مخالفین انکار کردیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے درمیان میں سے ایک پیغمبر مبعوث ہو اور پھر اسے یہ سب اعزاز و اکرام حاصل ہو، لہٰذا زیر بحث آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی کتاب کی طرف دعوت دی تھی تاکہ واضح ہوجائے کہ رسالت کا پروگرام کوئی نئی چیز نہیں اور تاریخ شاہد ہے بنی اسرائیل نے بھی ایسی مخالفت اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا جیسی اب مشرکین کررہے ہیں ، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی (وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ) اور ہم نے بنی اسرائیل کے لئے وسیلہ ہدایت قرار دیا (وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِبَنِي إِسْرَائِيلَ) ۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب سے یہاں مراد "تورات" ہے کہ جو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ(ع) پر نازل فرمائی تھی ۔ اس کے بعد بعثتِ انبیاء کا بنیادی مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے ہم کہا کہ میرے غیر کو سہارا نہ بناؤ ﴿أَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا﴾ ۔[۱]

"عمل میں توحید" "عقیدے میں توحید" کی علامت ہے اور یہ امر توحید کی بنیادی باتوں میں سے ہے جو شخص عالمِ کائنات میں مؤثر حقیقی صرف اللہ کو جانتا ہے وہ اس کے غیر پر تکیہ نہیں کرے گا اور جو کسی اور سہارا بناتے ہیں یہ ان کے اعتقادِ توحید کی کمزوری کی دلیل ہے ۔

آسمانی کتب کی عالی تجلیاتِ ہدایت دلوں کو نورِ توحید سے روشن کردیتی ہے اور اس کے سبب انسان ہر غیر اللہ سے کٹ کر خدا سے وابستہ ہوجاتا ہے اور اسی پر تکیہ کرتا ہے ۔

بنی اسرائیل کو جن نعماتِ الٰہی سے نوازا گیا بالخصوص کتابِ آسمانی میں روحانی نعمت، اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان کے احساساتِ تشکر کو ابھارا جائے، ارشاد ہوتا ہے: اے ان لوگوں کی اولاد کہ جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا ﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ﴾ ۔[۲]

"﴿وقلنا لهم لا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا﴾"

اور ہم نے ان سے کہا کہ میرے سوا کسی کو پناہ گا نہ بناؤ۔

یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے اور "﴿إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾" ہے ہم آہنگ نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

یہ بات مت بھولو کہ "نوح ایک شکر گزار بندہ تھا" ﴿إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾۔

تم کہ جو اصحاب نوح کی اولاد ہوا اپنے با ایمان بزرگوں کی پیروی کیوں نہیں کرتے ہو؟ کیوں کفرانِ نعمت کی راہ اپناتے ہو؟

"شکور" مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "زیادہ شکر گزار"۔

بنی اسرائیل کو اصحاب نوح کی اولاد شاید اس لیے کہا گیا ہے کہ مشہور تواریخ کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے۔ ان کے نام "سام" "حام" اور "یافث" تھے۔ طوفان نوح کے بعد بنی نوع انسان انہی کی اولاد میں سے ہیں اور بنی اسرائیل بھی اس لحاظ سے انہی کی اولاد سے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تمام انبیاء اللہ کے شکر گزار بندے تھے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی کچھ ایسی خصوصیات احادیث میں مذکورہ ہیں کہ جن کے باعث انہیں خاص طور پر "عبداً شکوراً" کے لفظ سے نوازا گیا ہے۔ ان کے بارے میں روایات میں ہے کہ جب وہ لباس پہنتے، پانی پیتے، کھانا کھاتے یا انیں کوئی بھی نعمت نصیب ہوتی تو فوراً ذکر خدا کرتے اور شکر الٰہی بجالاتے۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

حضرت نوح ہر روز صبح اور عصر کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے:

اللّٰھم انی اشھدک ان ما اصبح او امس بی من نعمة فی دین او دنیا فمنک، وحدک لا شریک لک، لک الحمد و لک الشکر بھا علی حتّی ترضی، و بعد الرضا۔

خداوندا! میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ جو بھی نعمت مجھے صبح و شام پہنچتی ہے وہ نعمتِ دین ہو یا نعمت دنیا، وہ نعمتِ روحانی ہو یا نعمتِ مادی۔ سب تیری طرف سے ہے تو ایک اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں، حمد وثنا تیرے لیے مخصوص ہے اور شکر بھی تیرے ہی لیے ہے۔ میں تیرا اس قدر شکر کرتا ہوں کہ تو مجھ سے راضی ہو جا اور تیری رضا کے بعد بھی میں تیرا شکر کرتا ہوں۔

اس کے بعد امام نے مزید فرمایا کہ:---

ایسا تھا نوح کا شکر۔[۳]

اس کے بعد بنی اسرائیل کی داستان انگیز تاریخ کے ایک گوشے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ہم نے تورات میں بنی اسرائیل کو بتادیا تھا کہ تم زمین میں دو دفعہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کا ارتکاب کرو گے ﴿وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا﴾۔

"قضاء" کے اگرچہ بہت سے معانی ہیں لیکن یہاں یہ لفظ "بتانے" کے معنی میں آیا ہے۔

نیز بعد کی آیت کے قرینے سے لفظ "الارض" سے یہاں مراد فلسطین کی مقدس زمین ہے کہ جس میں مسجد الاقصیٰ واقع ہے۔

آئندہ آیات میں ان دو عظیم حوادث کا ذکر ہے جو اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر رونما ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب پہلے وعدے کا مرحلہ آپہنچا اور تم فساد، خونریزی اور ظلم کے مرتکب ہوئے او ہم اپنے بندوں میں سے ایک جنگ آزما گروہ تمہاری طرف بھیجیں گے تاکہ وہ تمہارے اعمال کی سزا کے طور پر تمہاری سرکوبی کرے ﴿فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ﴾۔

یہ روز آور لوگ اس طرح سے تم پر حملہ کریں گے کہ تمہارے افراد کو پکڑنے کے لیے گھر گھر کی تلاشی لیں گے (فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ)۔

اور یہ ایک قطعی اور ناقابلِ تغیر وعدہ ہے ﴿وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا﴾۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر اللہ کا لطف و کرم تمہارے شاملِ حال ہوا اور ہم نے تمہیں اس حملہ آور قوم پر غلبہ عطا کیا ﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ﴾۔

اور ہم نے تمہیں بہت مال و ثروت سے نوازا اور کثرت اولاد سے تمہیں تقویت بخشی ﴿وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ﴾۔

اس قدر کہ تمہری تعداد دشمن سے زیادہ ہوگئی ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا﴾۔[۴]

یہ الطاف الٰہی تمہارے لیے ہے کہ شاید تم ہوش میں آؤ، اپنی اصلاح کرو، برائیوں کو ترک کردو اور نیکیوں کا راستہ اختیار کرو کیونکہ "اگر نیکی کرو گے تو اپنے آپ ہی سے بھلائی کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو اپنے آپ ہی سے کرو گے ﴿إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا﴾۔

یہ ایک دائمی اصول ہے کہ نیکیاں اور برائیاں آخرکار خود انسان کی طرف لوٹتی ہیں۔ اگر کوئی ضرب لگاتا ہے تو در اصل وہ اپنے جسم پر لگاتا ہے اور اگر کوئی کسی کی خدمت کرتا ہے تو در حقیقت اپنی ہی خدمت کرتا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ نہ اس سزا نے تمہیں بیدار کیا اور نہ بارِ دیگر نعماتِ الٰہی حاصل ہونے نے۔ تم پھر بھی سرکشی کرتے رہے اور راہِ ظلم و تجاوز اختیار کیے رہے۔ تم نے زمین پر بہت فسادپیدا کردیا اور غرور و تکبر میں حد سے گزر گئے۔

پھر اللہ کے دوسرے وعدے کی تکمیل کا مرحلہ آپہنچا تو ایک اور زبردست جنگجو گروہ تم پر مسلط ہوجائے گا اور وہ تمہارا یہ حال کرے گا کہ تمہارے چہرے غمزدہ ہوجائیں گے ﴿فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوئُوا وُجُوهَكُمْ﴾۔

یہاں تک کہ وہ تمہاری عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کو تمہارے ہاتھ سے چھین لیں گے "اور اس مسجد میں داخل ہوجائیں گے جیسے پہلی مرتبہ دشمن اس میں داخل ہوئے تھے" ﴿وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾۔

وہ اسی پر بس نہیں کریں گے بلکہ "ان کے سارے آباد شہر اور زمین اجاڑ کے رکھ دیں گے" ﴿وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا﴾۔

اس کے باوجود توبہ اور خدا کی طرف بازگشت کے دروازے تم پر بند نہیں ہوئے پھر بھی "ممکن ہے اللہ تم پر رحم کرے" ﴿عَسىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ﴾۔

اور اگر ہماری طرف لوٹ آؤ تو ہم بھی اپنے لطف ں کرم کا رخ پھر تمہاری جانب کردیں گے اور اگر تم نے فساد اور اکڑپن کو نہ چھوڑا تو پھر تمہیں ہم شدید عذاب میں مبتلا کردیں گے ﴿ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا﴾۔ اور پھر یہ تو دنیا کی سزا ہے جبکہ "جہنم کو ہم نے کافروں کے لیے سخت قید خانہ قرار دیا ہے" ﴿ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا﴾۔ [۵]

۱۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے بعض مفسرین نے "أَلاَّ تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِی وَکِیلًا" کو "لئلاَّ تَتَّخِذُو---" سمجھا ہے اور بعض نے "أن" کو زائد اور "قلنا لهم" کو مقدر سمجھا ہے کہ جو مجموعی طور پر یوں ہوگا:

۲۔ "ذُرِیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ" جملہ ندائیہ ہے اور تقدیر میں "یا ذریة من حملنا مع نوح" تھا رہا یہ احتمال کہ "ذریة" "وکیلا" کا بدل ہے یا "تتخذوا" کا مفعول ثانی ہے۔

۳۔ مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۴۔ "نفیر" اسم جمع ہے اس کا معنی ہے "لوگوں کا ایک گروہ" بعض کہتے ہیں کہ یہ "نفر" کی جمع ہے اور در اصل یہ "نفر" (بوزن "عفو") کے مادہ سے کوچ کرنے اور کسی چیز کو سامنے لانے کے معنی میں ہے، اسی وجہ سے اس گروہ کو "نفیر" کہتے ہیں کہ جو کسی چیز کی طرف حرکت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

۵۔ "حصیر" "حصر" کے مادہ سے "قید" کے معنی میں ہے اور ہر وہ جگہ جس سے نکلنے کی راہ نہ ہو اسے "حصیر" کہتے ہیں چٹائی کو بھی حصیر اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے مختلف حصے باہم بنے ہوئے اور محصور ہوتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ بنی اسرائیل کے دو تاریخی فسادات:

زیرِ نظر آیات میں بنی اسرائیل کے دو اجتماعی انحرافات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ۔ یہ انحرافات فساد اور سرکشی پر منتج ہوئے ۔ ان میں سے ہر ایک کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت زور آور لوگوں کو مسلط کردیا تاکہ وہ انہیں سخت سزادیں اور کیفرِ کردار تک پہنچائیں ۔

بنی اسرائیل کی تاریخ بہت داستان انگیز ہے ۔ وہ تاریخ کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہیں کبھی انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور کبھی وہ شکست سے دوچار ہوئے لیکن قرآن یہاں کن حوادث کی طرف اشارہ کررہا ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے ۔ اس سلسلے میو ہم بطور نمونہ چند ایک کا ذکر کرتے ہیں :

۱۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے ان پر حملہ کیا اور بیت المقدس کو تباہ کردیا وہ بخت النصر تھا ۔ یہ بابل کا حکمران تھا ۔ اس حملے کے بعد بیت المقدس ستر برس تک اسی طرح برباد رہا یہاں تک کہ پھر یہودی اٹھے اور انہوں نے اس کی تعمیر نو کی ۔

دوسرا شخص جس نے ان پر حملہ کیا وہ قیصرِ روم "اسپیانوس" تھا ۔ اس نے اپنے وزیر "طرطوز" کو اس کام پر مامور کیا ۔ اس نے بیت المقدس کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو کمزور اور قتل کرنے میں پوری قوت صرف کردی ۔ یہ واقعہ تقریباً سو سال قبل مسیح پیش آیا ۔

لہٰذا ممکن ہے کہ وہ دو واقعات جن کی طرف قرآن حکیم میں اشارہ کیا گیا ہے یہی ہوں کہ جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی آئے ہیں کیونکہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں پیش آنے والے دوسرے واقعات اس قدر سنگین اور شدید نہیں تھے کہ ان کی حکومت بالکل ملیا میٹ ہوگئی ہو بخت النصر کے حملے نے ان کی طاقت و شوکت کو بالکل تہس نہس کرکے رکھ دیا ۔ "کورش" کے زمانے تک ان کی صورتِ حال اسی طرح رہی ۔ اس کے بعد پھر بنی اسرائیل بر سر اقتدار آئے ۔ ان کی حکومت اسی طرح برقرار رہی یہاں تک کہ پھر قیصرِ روم نے ان پر حملہ کیا اور ان کی حکومت کو ختم کردیا ۔ پھر ایک طویل مدت وہ دربدر رہے (اور اب پھر کچھ عرصہ پیشتر ان لوگوں نے انسانیت کُش سامراجی قوتوں کی مدد سے ایک حکومت قائم کی ہے اور اب وہ اس کی توسیع کے لیے کوشاں ہیں) ۔[۱]

۲۔ طبری اپنی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے فرمایا:

پہلے فساد سے مراد زکریا اور بہت سے انبیاء کا قتل ہے اور پہلے وعدے سے مراد بخت النصر کے ذریعے اللہ کی طرف سے ان سے انتقام لینے کا وعدہ ہے اور دوسرے فساد سے مراد وہ شورش ہے جو انہوں نے ”آزادی“ کے بعد ایران کے ایک بادشاہ کی سرکردگی میں برپا کی اور یہ لوگ فساد اور خرابی کے مرتکب ہوئے جبکہ دوسرے وعدے سے مراد بادشاہِ روم ”انطیاخوس“ کا حملہ ہے۔

ایک حد تک تو یہ تفسیر پہلی تفسیر پر منطبق کی جاسکتی ہے لیکن اس کا راوی قابلِ اعتماد نہیں ہے نیز حضرت زکریا علیہ السلام کی تاریخ کو بخت النصر اور اسپیانوس یا انطیا خوس کے زمانے پر منطبق نہیں کیا جاسکتا بلکہ بعض کے بقول بخت النصر ”ارمیا“ یا دانیال پیغمبر کا ہم عصر تھا اور یہ زمانہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے دور سے تقریباً چھ سو برس پہلے کا ہے لہٰذا کیونکر ممکن ہے کہ بخت النصر نے حضرت یحییٰ کے خون کے انتقام کے لیے قیام کیا ہو؟

۳۔ بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت داؤد(ع) اور حضرت سلیمان (ع) کے زمانے میں ایک مرتبہ بیت المقدس تعمیر ہوا اور بخت النصر نے اسے تباہ و برباد کردیا۔ یہی وہ پہلا وعدہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد بیت المقدس ہخامنشی بادشاہوں کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ پھر اسے طیطوس رومی نے برباد کیا (توجہ رہے کہ ہوسکتا ہے یہ ”طیطوس“ وہی ”طرطوز“ ہو جس کا سطورِ بالا میں ذکر آچکا ہے)۔ اس شہر کی یہی حالت رہی، یہاں تک کہ خلیفہ ثانی کے زمانے میں اسے مسلمانوں نے فتح کیا۔(۲)

یہ تفسیر بھی مندرجہ بالا دو تفسیروں سے کوئی زیادہ اختلاف نہیں رکھتی۔

۴۔ مندرجہ بالا تفاسیر اور دیگر تفاسیر کہ جو کم و بیش ان سے ہم آہنگ ہیں، کے مقابلے میں ایک اور تفسیر بھی ہے۔ اس کا احتمال سید قطب نے اپنی تفسیر فی ذکر کیا ہے۔ یہ تفسیر مذکورہ تفسیروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس تفسیر کے مطابق یہ واقعات گزشتہ زمانے میں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں پیش نہیں آئے بلکہ ان کا تعلق نزول قرآن سے بعد کے زمانے سے ہے۔ احتمالاً ان کا پہلا فساد ہٹلر کے زمانے سے مربوط ہے کہ جب ہٹلر کی قیادت میں جرمن کے نازیوں نے یہودیوں کے خلاف قیام کیا۔(۳)

لیکن۔ اس تفسیر میں یہ اشکال ہے کہ ان واقعات میں سے کسی واقعے میں بھی فتح مند قوم بیت المقدس میں داخل بھی نہیں ہوئی چہ جائیکہ بیت المقدس برباد ہوتا۔

۵۔ ایک احتمال اور بھی بعض حضرات کی طرف سے ذکر ہوا ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں واقعات دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے ہیں جبکہ صیہونزم کی بنیاد پڑی اور اسلامی ممالک کے قلب میں اسرائیل نامی حکومت تشکیل دی گئی بنی اسرائیل کے پہلے فساد اور سرکشی سے یہی مراد ہے اور پہلے انتقام سے مراد یہ ہے کہ جب ابتداء میں اسلامی ممالک اس سازش سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اس کے مقابلے کے لیے قیام کیا نتیجتاً انہوں نے بیت المقدس اور فلسطین کے کچھ شہر اور قبضے یہودیوں کے چنگل سے آزاد کروالیے اور مسجدِ اقصیٰ سے یہودی اثر و نفوذ بالکل ختم ہوگیا۔

دوسرے فساد سے مراد درندہ صفت سامراجی طاقتوں کے سہارے بنی اسرائیل کا وہ حملہ ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے بہت سے اسلامی علاقوں پر قبضہ جمالیا اور بیت المقدس اور میجد اقصیٰ کو اپنے زیر نگین کرلیا۔

اس بنا پر مسلمانوں کو بنی اسرائیل پر دوسری کامیابی کا انتظار کرنا چاہیے، مسجد اقصیٰ کو ان کے چنگل سے آزاد کروانا چاہیے اور اسلامی سرزمین سے ان کے اثر و نفوذ کا پوری طرح خاتمہ کردینا چاہیے۔ ساری دنیا کے مسلمان اسی روز کے منتظر ہیں اور اللہ نے اسی کے لیے مسلمانوں سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے۔[۴]

ان کے علاوہ بھی کچھ تفاسیر ہیں کہ جن کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

چوتھی اور پانچویں تفسیر کے مطابق آیات میں جو ماضی کے صیغے استعمال ہوئے ہیں ان سب کو مضارع کی حالت میں ہونا چاہیے تھا البتہ عربی ادب کے لحاظ سے جہاں فعل حروفِ شرط کے بعد آئے وہاں یہ معنی بعید نہیں ہے۔ لیکن یہ آیت:﴿ثم رددنا لكم الكرة عليهم و امددناكم با موال و بنين وجعلنا كم اكثر نفيراً﴾

ظاہری اعتبار سے اس بات کی غماز ہے کہ کم از کم بنی اسرائیل کا پہلا فساد اور اس کا انتقام گزشتہ زمانے میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر ایک اہم مسئلہ اس مقام پر لائق توجہ ہے۔ اس آیت پر غور کیجیے:﴿بعثنا عليكم عباداً لنا اولى بأس شديد﴾

ہم اپنے بندوں میں سے ایک زور آور گروہ تم پر مسلط کریں گے۔

ظاہراً یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ انتقام لینے والے افراد با ایمان بہادر تھے کہ جو "عباد" "لنا" اور "بعثنا" کے اہل تھے ۔ یہ وہ بات ہے کہ جس کا ذکر بہت سی مذکورہ تفاسیر میں نہیں آیا۔

البتہ اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لفظ ان کے علاوہ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلا۔ہابیل اور قابیل کے واقعے میں ہے: ﴿فَبَعَثَ اللہ غُرَابًا یَبْحَثُ فِی الْأَرْضِ﴾

اللہ نے ایک کوّا بھیجا کہ جو زمین کو کریدتا تھا۔(مائدہ۔۳۱)

نیزیہی لفظ زمین و آسمان کے عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ یَبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ﴾۔(انعام۔۶۵)

اسی طرح لفظ "عباد" اور "عبد" قابل مذمت افراد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ فرقان کی آیت ۵۸ میں یہ لفظ گنہگاروں کے

لیے استعمال ہوا ہے:﴿وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِیرًا﴾

نیز سورہ شوریٰ کی آیت ۲۷ میں سرکشوں کے لیے یہ لفظ اس پیرائے میں استمال ہوا ہے:

﴿وَلَوْ بَسَطَ اللہ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِی الْأَرْضِ﴾

اسی طرح سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۸ میں خطا کاروں اور منکرین توحید کے بارے میں فرمایا گیا ہے:﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾

لیکن۔ ان تمام چیزوں کے باوجو اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر یقینی قرینہ موجود نہ ہوتو زیر بحث آیات کا ظاہری اسلوب یہی کہتا ہے کہ انتقام لینے والے اہلِ ایمان ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات اجمالاً ہم سے کہتی ہیں کہ بنی اسرائیل نے دومرتبہ فساد برپا کیا اور سرکشی اختیار کی اور اللہ نے ان سے سخت انتقام لیا۔ اس بات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بنی اسرائیل، ہم اور تمام انسان اس سے عبرت حاصل کریں اور یہ جان لیں کہ ظلم و ستم اور فساد انگیزی خدا کی بارگاہ میں سزا کے بغیر نہیں رہ سکتی اور جب ہمیں اقتدار یا قوت حاصل ہو تو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دردناک حوادث ہمارے انتظار میں ہیں لہٰذا گزشتہ لوگوں کی تاریخ سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔

۲۔ جو کام بھی کرو گے اپنے ساتھ ہی کرو گے:

زیر بحث آیات میں اس بنیادی اصول کی نشاندہی کی گئی ہے کہ تمہاری اچھائیاں اور برائیاں خود تمہاری طرف لوٹتی ہیں۔ اگرچہ ظاہراً اس جملے کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں لیکن واضح ہے کہ اس مسئلے میں بنی اسرائیل کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ یہ تو پوری تاریخ انسانی کے لیے ایک دائمی قانون ہے اور خود تاریخ اس کی شاہد ہے۔[۵]

بہت سے ایسے لوگ تھے جنہوں نے غلط اور برے کاموں کی بنیاد رکھی، ظالمانہ قوانین بنائے اور غیر انسانی بدعتوں کو رواج دیا اور آخر کار ان کا نتیجہ خود ان کے لیے کھودا تھا خود اس میں جا گرے۔

خاص طور پر زمین پر فتنہ و فساد برپا کرنا، برتری جتانا اور اپنے تئیں بڑا سمجھنا ﴿علواً کبیراً﴾ ایسے امور ہیں کہ جن کا اثر اسی جہان میں انسان کا دامن آپکڑتا ہے۔ اسی بناء پر بنی اسرائیل بارہا سخت شکست سے دوچار ہوئے، پراگندہ ہوئے اور انہیں رسوا کن انجام کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ انہوں نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا۔

اس وقت بھی صیہونی یہودیوں نے دوسروں کی زمین غضب کرنے، دوسروں کو بدر آوارہ وطن کرنے اور ان کی اولاد کو قتل و برباد کرنے کا عمل شروع کررکھا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ کے گھر بیت المقدس کی حرمت کا بھی پاس نہیں کیا۔ عالمی سطح پر ان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ کسی قانون اور اصول کی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر کوئی ایک فلسطینی مجاہد ان کی طرف رائفل کی ایک گولی چلاتا ہے تو اس کے بدلے وہ مہاجر کیمپوں، بچوں کے اسکولوں اور ہسپتالوں پر وحشیانہ بمباری کرتے ہیں اور اپنے ایک شخص کے بدلے بعض اوقات سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں تڑپا دیتے ہیں اور اپنے ایک شخص کے بدلے بعض اوقات سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں تڑپا دیتے ہیں اور بہت سے گھروں کو تباہ و برباد کردیتے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو کسی بین الاقوامی قانون کا پابند نہیں سمجھتے اور اعلانیہ سب کو پاؤں تلے روندیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام تر قانون سکنی، بے انصافی اور خلافِ انسانیت کردار اس لیے ہے کہ اسرائیل کو انسان کش عالمی طاقت امریکہ کی سرپرستی حاصل ہے لیکن یہ امر بھی قابل تردید و شک نہیں کہ خود یہ قوم سراپا ظلم و بربریت ہے اور تمام تر انسانی اقدار کو پامال کرنے پر اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا یہ طرز عمل بذاتِ خود زمین پر فساد برپا کرنے، بڑا بننے کی خواہش اور ظلم و استکبار کا مصداق ہے۔ انہیں اب انتظار کرنا چاہیے کہ پھر "عباداً لنا اولی بأس شدید" کے مصداق لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان پر غلبہ پائیں گے اور ان کے بارے میں اللہ کا قطعی وعدہ عملی شکل اختیار کرے گا۔

۳۔ آیات کی تطبیق اسلامی تاریخ پر:

متعدد روایات میں زیر نظر آیات کو مسلمانوں کی تاریخ میں پیش آنے والے حوادث پر منطبق کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق پہلا فساد اور ظلم حضرت علی علیہ السلام کی شہادت ہے اور دوسرا امام حسن علیہ السلام کی شہادت جبکہ "بعثنا علیکم عباداً لنا اولی بأس شدید" کے مصداق مہدی قائم علیہ السلام اور ان کے انصار ہیں۔

بعض دوسری روایات کے مطابق یہ ایک ایسی قوم کی طرف اشارہ ہے جو حضرت مہدی علیہ السلام سے پہلے قیام کریگی۔(۱۰)

یہ واضح ہے کہ ان احادیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ زیر بحث آیات ی تفسیر اپنے لفظی مفہوم کے مطابق نہیں ہے کیونکہ یہ آیات پوری صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارے میں گفتگو کررہی ہیں بلکہ ان روایات سے مراد یہ ہے کہ اس امت میں بھی ایسے فسادات اور مظالم کی ایسی ہی سزا ہوگی۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مذکورہ بالا طرزِ عمل اگرچہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے لیکن یہ ایک عمومی قانون ہے جو تمام اقوام و ملل کیلئے ہے اور ساری تاریخ انسانی پر جاری و ساری ایک عمومی سنت ہے۔

۱۔ تفسیر المیزان، ج ۱۳ ص ۴۶۔

۲۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۷ حاشیہ ص ۲۰۹ از قلم عالمِ معظم شعرانی مرحوم۔

۳۔ تفسیر فی ظلال، ج ۵ ص ۳۰۸۔

۴۔ مجلہ مکتب اسلام شوارہ ۱۲ سال ۱۲ ویک سال ۱۳ بحث تفسیر آقائی ابراہیم انصاری۔

۵۔ نور الثقلین ج ۳، ص ۱۳۸۔

سعادت کا بالکل سیدھا راستہ

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل، ان کی آسمانی کتاب تورات، ان کی طرف سے احکام الہٰی خلاف ورزی اور اس سلسلے میں ان کی سزاؤں سے متعلق گفتگو تھی۔اب مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید کی طرف بات کا رخ موڑا گیا ہے کہ جو کتب آسمانی کی آخری کڑی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن لوگوں کو مستقیم ترین اور بالکل سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے﴿إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِى لِلَّتِى هِىَ أَقْوَمُ﴾۔

"اقوم" "قیام" کے مادہ سے ہے اورچونکہ انسان جب کسی اہم کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو قیام کرتا ہے اور کام شروع کردیتا ہے اسی لحاظ سے احسن طریقے اور تندہی سے انجام دینے کے لیے "قیام" بطور کنایہ استعمال ہوا ہے۔

ضمناً یہ بھی کہہ دیا جائے کہ لفظ " استقامت " بھی اسی مادے سے ہے اور"قیم "بھی اسی مادے سے ہے جس کا معنی ہے صاف و شفاف، مستقیم،ثابت اور ٹھوس۔

"اقوم "چونکہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے لہٰذا صاف تر، مستقیم تر اور بالکل سیدھا کے معنی میں ہے۔ اس لحاظ سے زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا:

قرآن ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو زیادہ مستقیم، زیادہ صاف اور زیادہ محفوظ و مضبوط ہے۔

قران کے پیش کردہ عقائد صاف اور مستقیم ہیں،روشن و واضح ہیں،قابل ادراک ہیں، ہر قسم کے ابہام اور خرافات سے پاک ہیں۔وہ عقائد کہ جو عمل کی دعوت دیتے ہیں انسانی صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہیں اور انسان اور عالم فطرت کے قوانین میں ہم آہنگی برقرار رکھتے ہیں۔

یہ قرآن زیادہ صاف اور زیادہ مستقیم ۔اس لحاظ سے کہ ظاہر و باطن،عقیدہ و عمل،فکر و نظر اور طرز حیات کے در میان یکجہتی پیدا کرکے سب کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

یہ قرآن صاف تر اور مستقیم تر ہے۔ سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام اور قوانین کے اعتبار سے۔ اس کا نظام تمام روحانی پہلوؤں کی بھی پرورش کرتا ہے اور مادی لحاظ سے بھی کمال و ارتقاء آفرین ہے۔

یہ قرآن عبادت میں بھی افراط و تفریط سے بچاتا ہے۔

اسی طرح قرآن کا اخلاقی نظام بھی ہر طرح کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھتا ہے ۔ حرص اور طمع سے بھی بچاتا ہے، اسراف اور فضول خرچی سے بھی نجات دلاتا ہے، بخل اور کنجوسی سے بھی محفوظ رکھتا ہے، حسد سے بھی دو کتا ہے کمزور بن جانے اور دوسروں کو کمزور کر کے خود بڑا بن بیٹھنے سے بھی بچاتا ہے ۔

یہ قرآن صاف تر اور مستقیم تر ہے ۔ اپنے پیش کردہ نظام حکومت کے لحاظ سے کہ جو عدل و انصاف پر مبنی ہے اور ظلم اور ظالموں کی سرکوبی کرتا ہے ۔

جی ہاں !قرآن ایسے راستے کی ہدایت کرتا ہے جو ہر لحاظ سے زیادہ صاف، زیادہ مستقیم، زیادہ محفوظ اور زیادہ مضبوط ہے ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ "افعل التفضیل "کا صیغہ یہ معنی دیتا ہے کہ دوسری اقوام کے مذاہب میں بھی استقامت اور عدالت کی خوبیاں موجود تھیں جبکہ قرآن میں ان کی نسبت زیادہ ہیں لیکن چند پہلوؤں کی طرف توجہ کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہوجاتا ہے ۔ کیونکہ:

اولاً: اگر موازنہ دوسرے آسمانی ادیان کے ساتھ ہو تو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں صاف، مستقیم اور مضبوط دین تھا لیکن تکامل و ارتقاء کے مطابق جب ہم آخری مرحلے یعنی مرحلہ خاتمیت تک پہنچیں گے تو ایسا دین موجود ہوگا کہ جو صاف تر، مستقیم تر اور مضبوط تر ہوگا ۔

ثانیاً: اگر موازنہ دیگر آسمانی مذاہب کی بجائے دیگر مذاہب سے ہو تو بھی " افعل التفضیل " با معنی ہوگا کیونکہ ہر مکتب و مذاہب کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کم ازکم ان خوبیوں کا لحاظ رکھیں لیکن ان میں موجود کوتاہیوں ، خرابیوں اور انحرافوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے اور پھر قرآن سے ان کا موازنہ کیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ یہ دین زیادہ صاف اور انسان کی روحانی و مادی ضروریات سے زیادہ ہم آہنگ ہے لہذا یہ زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ ہے ۔

ثالثاً: جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں کہ " افعل التفضیل " کا صیغہ ہمیشہ اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ لازماً کسی چیز سے موازنہ کیا جارہا ہے اور لازماًدوسری طرف کوئی چیز اس کے کچھ مفہوم کی حامل ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اَفَمَنْ يَّهْدِىَ اِلَى الْحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّىَ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى﴾

جو شخص حق کی طرف دعوت دیتا ہے کیا رہبری کا وہ زیادہ حق رکھتا ہے اور زیادہ اہل ہے یا وہ شخص جو حق کے راستے کا راہی ہی نہیں ۔ (یونس۔۳۵)

ضمنی طور پر اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "اقوم" کا ایک معنی زیادہ ثابت اور زیادہ محفوظ و مضبوط ہے نیز آیت کی عبارت میں موازنے کے طور پر کسی دوسری چیز کا ذکر نہیں ہے جبکہ اصطلاح کے مطابق "متعلق کا حذف ہونا عمومیت و شمولیت کی دلیل ہے" ان امور کی طرف توجہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو اسلام اور رسول کی خاتمیت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کیونکہ اس آیت کے مطابق یہ دین زیادہ ثابت، زیادہ باقی، زیادہ ٹھوس، زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ ہے ۔ (غور کیجیے گا) ۔

اس مستقیم الٰہی پروگرام سے لوگوں کا تعلق چونکہ دو طرح ہے لہٰذا اس کے بعد اس رابطے اور تعلق کے نتیجے کا انہی دو حوالوں سے ذکر کیا گیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے: جن با ایمان لوگوں نے نیک عمل انجام دیئے ہیں قرآن انہیں خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے﴿وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا﴾[1]

اور وہ کہ جو آخرت اور اس کی عظیم عدالت پر ایمان نہیں رکھتے (اور اس لیے انہوں نے اعمال صالح انجام نہیں دیئے) انہیں آگاہ کردیتا ہے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہم نے تیار کر رکھا ہے﴿وَأَنَّ الَّذِينَ لَايُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾

مومنین کے لیے بشارت کی تعبیر تو واضح ہے لیکن بے ایمان اور سرکش افراد کے لیے در حقیقت یہ ایک قسم کا استہزاء ہے یا پھر مومنین کے لیے بشارت ہے کہ ان کے دشمنوں کا یہ انجام ہوگا ۔

اس طرف بھی نظر جاتی ہے کہ مومنین کے لیے اجمالاً "اجراً کبیراً" فرمایا گیا ہے جبکہ بے ایمان افراد کی سزا کے لیے صراحتاً "عذابا الیماً" فرما گیا ہے ۔ ان دونوں تعبیرات کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ معنوی و مادی اور روحانی و جسمانی تمام پہلوؤں پر محیط ہے ۔

رہی یہ بات کہ دوزخیوں کی صفات میں سے صرف "آخرت پر ایمان نہ لانے" کی نشاندہی کی گئی ہے جبکہ ان کے اعمال کے بارے میں کوئی بات نہیں کی گئی ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس بناء پر ہو کہ اگر انسان اس عظیم عدالت پر ایمان رکھتا ہو تو گناہوں سے بچانے کے لیے یہ ایمان سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے ۔ اس سے قطع نظر انکار قیامت کا مطلب انکارِ خدا بھی ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ عادل و حکیم خدا اس جہان کے لوگوں کو ان حالات میں کہ جو ہم دیکھ رہے ہیں ، ان کی حالات پر چھوڑ دے اور کوئی دوسرا جہاں موجود نہ ہو ۔ یہ امر نہ اس کی حکومت سے مطابقت رکھتا ہے

اور نہ اس کی عدالت سے ۔ علاوہ ازیں آیت میں موجود جزاء سزا کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور یہ گفتگو آخرت اور عدالتِ الٰہی کے مسئلے سے مناسبت رکھتی ہے اس لیے یہاں آخرت پر ان کے ایمان نہ لانے کا ذکر کیا گیا ہے ۔

اگلی آیت میں گزشتہ بحث کی مناسبت سے بے ایمانی ایک اہم علت بیان کی گئی ہے اور وہ مختلف امور کے بارے میں درکار آگاہی کا نہ ہونا ۔ ارشاد ہوتا ہے: جیسے انسان بھلائی کا خواہشمند ہوتا ہے اسی طرح جلد بازی کرتے ہوئے اور درکار آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے برائی طلب کرنے لگتا ہے ﴿وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ﴾ ۔

کیونکہ انسان پر جلد باز ہے ﴿وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا﴾ ۔

اس مقام پر "دعا" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر قسم کی خواہش و طلب شامل ہے چاہے زبان سے ہو یا عمل سے ۔

در حقیقت زیادہ سے زیادہ اور جلد منافع کے حصول کی تڑپ اس امر کا سبب بنتی ہے کہ مسائل کے تمام پلوؤں کے بارے میں غور و فکر اور تحقیق و مطالعہ نہیں کرتا اور بسا ایسا ہوتا ہے کہ اس جلد بازی کے باعث انسان حقیقی فائدے اور منافع کی تمیز نہیں کر پاتا بلکہ خواہشات کی سرکش اور بے تابی حقیقت کا چہرہ چھپا دیتی ہے اور انسان اپنی بھلائی کی بجائے برائی کے پیچھے چل نکلتا ہے ۔ اس حالت میں جس طرح انسان اللہ سے بھلائی کا تقاضا کرتا ہے عدم معرفت اور غلط پہچان کے باعث برائیوں کا بھی تقاضا کرنے لگتا ہے اور جس طرح بھلائی کے لیے کوشش کرتا ہے برائی کے بھی پیچھے چل پڑتا ہے ۔ یہ نوع انسانی کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت ہے اور سعادت کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے ۔

کتنے ہی ایسے لوگ ہیں کہ جو جلد بازی کی وجہ سے خطرناک گڑھوں میں گر جاتے ہیں ۔ اپنے تئیں وہ امن و خوشحالی کے راستے پر جا رہے ہوتے ہیں لیکن بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ منزل سعادت کے تصور میں برائیوں اور بدبختیوں میں جا پڑتے ہیں افتخار و عزت کی بجائے ذلت و رسوائی کے پانیوں میں جا اترتے ہیں ۔ یہ برا نتیجہ عجلت پسندی اور جلد بازی کا ہے ۔

جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کا مفہوم نہ لفظی دعا میں منحرف ہے اور نہ عملی طلب میں ۔ بلکہ یہ سب کچھ ایک جامع مفہوم میں موجود ہے ۔ لہٰذا اگر بعض مفسرین نے اسے کسی ایک حصے میں محدود کیا ہے تو اس کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے ۔ نیز اگر بعض روایات میں صرف لفظی دعا کا ذکر ہے تو وہ در اصل ایک مصداق کی نشاندہی

ہے نہ کہ پورے مفہوم کا ذکر ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

واعرف طریق نجاتک وھلاکک، کی لاتدعوا اللہ بشیء عسی فیہ ھلاکک، وانت تظن ان فیہ نجاتک، قال اللہ تعالیٰ "﴿وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا﴾"

اپنی نجات اور اپنی ہلاکت کے راستے کو خوب پہچان لے تاکہ تو اللہسے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کربیٹھے کہ جس میں تیری ہلاکت ہے جبکہ تیرا یہ گمان ہو کہ اسی میں تیری نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ انسان جس طرح سے بھلائی کی دعا کرتا ہے اسی طرح برائی کی طلب کرنے لگتا ہے کیونکہ انسان جلد باز ہے۔

لہٰذا خیر و سعادت تک پہنچنے کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ انسان جو بھی کام کرنا چاہے بڑے غور و خوض، سمجھداری اور جلد بازی سے بچتے ہوئے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کے اور اس سلسلے میں بے سوچ سمجھے فیصلوں سے بچے اور خواہشات نفسانی کی آلودگیوں سے اپنی رائے کو پاک رکھے پھر اللہ سے اس کام کے لئے مدد طلب کرے تاکہ منزل سعادت سے ہمکنار ہو سکے اور ہلاکت کے گڑھے میں نہ جا گرے۔

اگلی آیت میں خلقت شب و روز، ان کی برکات اور علم میں ایک نظم وحساب کی موجودگی کے بارے گفتگو کی گئی ہے تاکہ توحید و معرفت الٰہی کی دلیل بھی بنے اور گزشتہ سے پیوستہ بحث قیامت کی بھی تکمیل ہوجائے اور اس کے علاوہ کاموں میں غور و حوض کرنے اور عجلت سے کام نہ لینے کے ضروری ہونے کے لیے بھی مشاہدہ بن سکے۔ ارشاد ہوتا ہے:

رات اور دن کو ہم نے اپنی نشانیاں قرار دیا ہے﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ﴾۔

پھر ہم نے رات کی نشانی کو محو کردیا اور اس کی جگہ دن کی نشانی لے آئے کہ جو ضیاء بخش ہے﴿فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً﴾۔

اس سے ہمارے دو مقصد تھے۔ پہلا یہ کہ "تم اپنے رب کے فضل سے بہرہ ور ہوجاؤ" ﴿لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ﴾۔

رات کو آرام کرو اور دن میں کام کاج اور بھاگ دوڑ کرو اور اس کے نتیجہ میں نعمات الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ۔

دوسرا یہ کہ اپنے کاموں کے نظم و حساب کے لیے سالوں کی تعداد اور مدت معین کرو اور وقت کا حساب کتاب اور تقسیم طے کرلو

﴿وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ﴾ ۔

اور ہم نے سب کچھ مفصل اور واضح کردیا ہے﴿وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا﴾ ۔تا کہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے ۔

”آیۃ اللیل“ اور ”آیۃ النہار“ سے مراد خود رات دن ہیں اور ان میں سے ہر ایک پروردگار کی ایک نشانی ہے یا ”آیۃ اللیل“ سے مراد چاند اور ”آیۃ النہار“ سے مراد سورج ہے ۔اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔ لیکن آیت پر ہی غور و خوض کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر صحیح ہے ۔

”وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ“ کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے ہر ایک اثباتِ وجود خدا کے لیے دلیل، ایک نشانی ہے اور آیتِ شب محو ہونے سے مراد یہ ہے کہ رات کے تاریک پردے دن کے اجالے کی وجہ سے چھٹ جاتے ہیں اور رات کے وقت جو کچھ چھپ جاتا ہے دن کے روشنی میں آشکار ہوجاتا ہے ۔

قرآن نے جو بعض دوسری آیات (یونس۔۵)میں سال اور مہینے کے حساب کے لیے سورج اور چاند کو پیمانہ اور ذریعہ قرار دیا ہے وہ ہمارے مذکورہ بیان کے منافی نہیں ہے کیونکہ انسانی زندگی میں نظم اور حساب کے پیدا ہونے کو رات دن کی طرف بھی نسبت دی سکتی ہے اور چاند سورج کی طرف بھی چونکہ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں ۔ نہج البلاغہ کے خطبہ اشباح میں عظمتِ الٰہی کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

”وجعل الشمس آية مبصرة لنهارها، وقمرها، آية ممحوة من لييلها، واجراهما فى مناقل مجراهما، وقدر سيرهما فى مدارج درجهما، ليمز بين الليل والنهار بهما، وليعلم عدد السنين والحساب بمقاديرهما“

سورج کو دن ضیاء بخش نشانی قرار دیا اور چاند کو رات کی محو کرنے والی نشانی بنایا اور ان دونوں کو رواں دواں کردیا ۔ ان کی حرکت کے مراحل مقرر کیے تا کہ رات اور دن کے درمیان فرق پیدا کرے اور دونوں سے حاصل کیے گئے حساب کتاب سے سالوں کا اندازہ لگایا جاسکے ۔

یہ تفسیر بھی مذکورہ بالا پہلی تفسیر کے منافی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں سال کے حساب کتاب کو رات دن سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے اور چاند سورج سے بھی کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں ۔

۱۔ سورہ نساء کی آیت ۳۸ کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ لفظ ”بشارت“ دراصل ”بشرۃ“ سے لیا گیا ہے اور ”بشرۃ“ کا ہے ”چہذہ“ اور ہر چیز جو انسان پر اثر انداز ہو، اسے مسرور یا مغموم کردے اسے ”بشارت“ کہتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا انسان ذاتی طور پر جلد باز ہے؟

زیر بحث آیت میں تو انسان کو جلد باز کہا گیا ہے لیکن کسی آیات بھی ہیں جن میں انسان کو "ظلوم"، "جھول"، "کفور"، سرکش، کم ظرف اور مغرور وغیرہ کہا گیا ہے۔

ان تعبیروں سے بعضی اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ظرف یہ کہا گیا ہے اور دوسری طرف انسان کے پاک فطرت اور الٰہی روح کے حامل ہونے کا ذکر ہے۔ ان دونوں کو کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

دوسری لفظوں میں اسلامی تصور کائنات کے مطابق انسان ایک عالی مرتبہ موجود ہے خلیفۃ اللہ اور زمین میں اللہ کی نمائندگی کے لایق ہے۔ انسان فرشتوں کا استاد اور ان سے برتر ہے۔ یہ بات مذکورہ مذمت آمیز تعبیرات سے کیونکہ ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب ایک ہی جملے میں دیا جاسکتا ہے کہ انسان کا یہ تمام تر مقام، اہمیت اور قیمت سے مشروط ہے اور وہ شرط ہے "ہادیاں الٰہی کے زیر نظر تربیت"۔ اس صورت کے علاوہ انسان خودرو گھاس پھونس کی طرح پرورش پاتا ہے اور خواہشات و شہوات میں غوطے کھاتا رہتا ہے اور اپنی عظیم صلاحتیں کھو دیتا ہے اور اس میں منفی پہلو آشکار ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر۔ اگر مذکورہ شرط پوری ہوجائے تو وہ تمام مثبت صفات جو قرآن حکیم میں انسان کے بارے میں آئی ہیں وہ صورت پذیر ہو جائیں گی اور اگر یہ شرط پوری نہ ہوئی تو مذکورہ منفی صفات نمایاں ہوجائیں گی۔ اسی لیے سورہ معارج کی آیہ ۱۹ تا ۲۳ میں ہے:

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا، إِلاَّ الْمُصَلِّينَ، الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾

انسان بہت کم ظرف پیدا ہوا ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بے تاب ہو جاتا ہے اور جب اسے کوئی اچھائی میسر آتی ہے تو بخل کرتا ہے سوائے ان نمازگزاروں کے کہ جو ہمیشہ اس طرز عمل پر باقی رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی آٹھویں جلد میں سورہ یونس کی آیت ۱۲ کے ذیل میں بیان کی جاچکی ہے۔

۲۔ جلد بازی۔ ایک مصیبت:

کسی چیز کو زیادہ پسند کرنا، سطحی اور محدود فکر، خواہشات کا انسان پر غلبہ اور کسی چیز کے بارے میں حد سے زیادہ اچھا گمان۔ یہ سب جلد بازی کے عوامل ہیں۔ عام طور پر سطحی مطالعہ اور ابتدائی آگاہی کسی امر کی حقیقت اور اس کے نفع و نقصان کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہوتے لہٰذا عموماً جلد بازی ندامت، نقصان اور پشیمانی کا موجب بنتی ہے۔یہاں تک کہ زیر بحث آیات کے مطابق بعض اوقات عجلت کے باعث انسان غلط کاموں کے پیچھے ایسی تیزی سے اچھے کاموں کے پیچھے جاتا ہے۔

پوری تاریخ انسانی میں انسان کو جن تلخ کامیوں، شکستوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا شمار ممکن نہیں اور خود ہم نے اپنی زندگی میں اس کے کئی نمونے دیکھے ہیں اور اس کے تلخ ثمرات چکھے ہیں۔

"عجلت" کے مقابل "تثبت" اور "تانی" یعنی توقف کرنا، تفکر و تامل کرنا اور کسی کام کے انجام دینے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں کا جائز لینا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"انما أهلک الناس العجلة ولو ان الناس تثبتوا لم يهلکو أحد"

لوگوں کو ان کی جلد بازی نے مار ڈالا اور لوگ تامل اور سوچ بچار سے کام انجام دیتے تو کوئی شخص ہلاک نہ ہوتا۔ (۱)

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مع التثبت تكون السلامة، وع العجلة تكون الندامة

توقف اور تامل کرنے میں سلامتی ہے اور جلد بازی میں ندامت ہے۔ (۲)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ان الانة من الله والعجلة من الشيطان

سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت شیطان کی جانب سے ہے۔ (۳)

البتہ اسلامی روایات میں "نیک کام جلدی کرنے کا باب" بھی موجود ہے۔ ان میں سے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، آپ فرماتے ہیں: ان الله يحب من الخير ما يعجل

اللہ کو پسند ہے کہ نیک کام میں جلدی کی جائے۔ (۴)

اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں۔یہاں بے جا تاخیر، تساہل اور آج کل کرنے کے مقابل عجلت کا حکم ہے کیونکہ یہ طرز عمل عام طور پر کاموں میں مشکلیں اور رکاوٹیں پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو اسی باب میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے،آپ فرماتے ہیں:

من هم بشيء من الخير فليعجله فان كل شيء فيه تأخير فان للشيطان فيه نظرة

جو شخص کسی کار خیر کا ارادہ کرے اسے چاہئے کہ اس میں جلدی کرے کیونکہ جس کام میں تاخیر کرو گے شیطان اس میں حیلے بہانے پیدا کردے گا۔ (۵)

اس بنا پر کہنا چاہئے کہ کاموں میں سرعت اور مضبوط ارادہ تو ضرور ہونا چاہیئے لیکن جلد بازی نہیں۔

دوسرے لفظوں میں مذموم ایسی جلد بازی ہے کہ نتیجے میں کام بغیر تمام پہلووں کا جائزہ لیے اور بغیر تحقیق و شناخت کے، صورت پذیر ہوجائے اور لایق تحسین ایسی سرعت ہے جو مصمم اردہ کرلینے کے بعد تاخیر سے بچنے کے لیے ہو۔

روایات میں ہے کہ "نیک کام میں جلدی کرو" یعنی پہلے یہ جان لو کہ یہ کام۔ کار خیر ہے اور جب اس کا اچھا ہونا ثابت ہو جائے تو پھر اس میں تساہل نہ برتو۔

۱۔ و۲۔ و۳۔ سفینۃ البحار، ج۱، ص۱۳۹؟

۴۔ اصول کافی، ج۱، کتاب ایمان وکفر، باب "تعجیل فعل الخیر"۔

۵۔ اصول کافی، ج۱، کتاب ایمان وکفر، باب "تعجیل فعل الخیر"۔

۳۔ کائنات میں نظم و حساب کا انسانی زندگی پر اثر:

تمام تر نظام کائنات کسی حساب کتاب اور نظم و شمار پر قائم ہے ۔ نظام عالم کی کوئی چیز بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ہے ۔ فطری امر ہے کہ انسان کہ جو اس سارے نظام کا ایک جزو ہے کسی حساب کتاب کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔

اسی بناء پر قرآن کی مختلف آیات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ چاند، سورج یا رات دن کا وجود انسان کے لیے نعمات الٰہی میں سے ہے کیونکہ یہ انسان زندگی میں نظم و حساب پیدا کرنے کا ایک عامل ہے ۔ کیونکہ بے نظم زندگی فنا اور نابود کا سبب ہے ۔

ایک۔ "ابتغاء فضل الله "۔ کہ جو عام طور پر مفید اور تعمیر کام کے معنی میں ہے ۔

دوسرا ۔ سالوں کا حساب جاننا ۔

ان دونوں کا اکٹھا ذکر شاید اس بات کی دلیل ہے کہ "ابتغاء فضل الله ""نظم و حساب" سے استفادہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے ۔

گزشتہ زمانے میں شاید یہ بات اتنی واضح نہیں تھی لیکن آج کی دنیا تو اعداد و شمار کی دنیا ہے آج تو ہر اقتصادی، سماجی، سیاسی، سائنسی اور ثقافتی ادارے میں شماریات کا شعبہ ہوتا ہے ۔ ہر کار خانے میں شعبہ ہوتا ہے ۔ دور حاضر میں اس قرآن اشارے کی گہرائی کی طرف توجہ کرنا چاہئے اور یہ جاننا چاہیئے کہ قرآن نہ صرف یہ کہ قرآن نہ صرف یہ کہ زمانہ گزرنے سے پرانا نہیں ہوتا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا ہے اس کی تازگی زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے ۔ (۱)

۱۔ اس سلسلے میں ہم نے سورہ یونس کی آیت ۵ کے ذیل میں بھی تفصیلی بات کی ہے، اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی آٹھویں جلد میں مذکورہ آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کیجئے ۔

آیات ۱۵،۱۴،۱۳

۱۳ ﴿وَكُلَّ إِنسانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا﴾

۱۴ ﴿اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾

۱۵ ﴿مَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾

ترجمہ

۱۳۔ اور ہر شخص کے اعمال کو ہم نے اس کے گلے کا رہار بنا دیا ہے اور روز قیامت اس کے لیے ہم ایک کتاب نکالیں گے کہ جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔

۱۴۔ (یہ اس کا نامہ اعمال ہی ہوگا۔ ہم اس کہیں گے) اپنی کتاب پڑھ، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔

۱۵ جو شخص بھی ہدایت پائے اس نے اپنے لیے ہدایت پائی اور جو شخص گمراہ ہو وہ اپنے ہی نقصان میں گمراہ ہوا (اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا) اور کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا ہم (لوگوں کو ان کی ذمہ داراریاں بتانے کے لیے) پیغمبر مبعوث کیے بغیر کسی (شخص یا قوم) کو عذاب نہیں دیتے۔

چادر اہم اسلامی اصول

گزشتہ آیات میں معادو قیامت اور حساب و کتاب کے بارے میں گفتگو تھی۔ اسی مناسب سے زیر بحث آیات میں انسان کے اعمال کے حساب و کتاب کے امرے میں بات کی گئی۔ گفتگو قیامت میں اس معاملے کی کیفیت سے شروع ہوتی ہے۔ ارساد ہوتا ہے: ہر شخص کے اعمال کو ہم نے اس کے گلے کا ہار بنادیا ہے

﴿وَكُلَّ إِنسانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ﴾۔

"طائر" پرندے کے معنی میں ہے لیکن عربوں کے درمیان معمول تھا کہ وہ پرندوں کے ذریعے نیک یا بد فال نکالتے تھے اور ان کی حرکت کی کیفیت سے نتیجہ نکالتے تھے۔ یہاں اس چیز کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً اگر ایک پرندہ ان کی دائیں طرف اڑرہا ہوتا تو ایک اسے نیک فال سمجھتے اور اگر بائیں طرف اڑرہا ہوتا تو اسے بد فال خیال کرتے۔ اسی لیے یہ لفظ زیادہ تر فال بد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ "تفال" زیادہ تر نیک فال کے لیے بولا جاتا ہے۔

آیات قرآن میں بھی بارہا "تطیر" فال بد کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً:
﴿وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ﴾
فرعون والوں کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو وہ اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے تھے۔ (اعراف۔ ۱۳۱)

نیز سورہ نمل کی آیت ۴۷ میں ہے: ﴿قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَعَكَ﴾
قوم صالح کے مشرکین کہنے لگے: ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو منحوس اور فال بد سمجھتے ہیں۔
اسلامی احادیث میں "تطیر" سے منع کیا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں "توکل علی اللہ" کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔
بہر حال زیر بحث آیت میں بھی "طائر" اس معنی کی طرف اشارہ ہے یا پھر یہ قسمت کے معنی میں ہے کہ جو نیک و بد فال کے قریب قریب ہے۔
قرآن در حقیقت کہتا ہے کہ نیک و بد فال اور اچھی بری قسمت کوئی چیز نہیں۔ یہ تو تمہارے اعمال ہیں کہ جنہیں تمہاری گردن میں لٹکایا جائے گا۔
"الزمناہ" (ہم نے لازم قرار دیا ہے اس کو) اور "فی عنقہ" (اس کی گردن میں) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے اعمال اور ان کے نتائج دنیا اور آخرت میں اس سے جدا نہیں ہوتے اور ہر حالت میں اسے ان کا مسئول اور ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ جو کچھ ہے عمل ہے باقی سب باتیں ہیں۔ بعض مفسرین نے لفظ "طائر" کے انسانی اعمال پر اطلاق سے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ انسان کے اچھے برے اعمال گویا ایک پرندے کی مانند ہیں کہ جو اس کے وجود سے پرواز کرتا ہے۔ اسی لیے ان پر "طائر" کا اطلاق ہوا ہے۔
زیر بحث آیت میں لفظ "طائر" اچھائی اور برائی سے انسان کے حصے کے معنی میں ہے یا دلیل اور رہنما کے معنی میں ہے یا نامہ اعمال کے معنی میں ہے یا برکت و نحوست کے معنی میں ہے۔
ان میں سے بعض تفاسیر سے تو وہی مفہوم نکلتا ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں جبکہ بعض تفاسیر آیت کے مفہوم سے بہت دور ہیں۔
اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: روزِ قیامت ہم اس کے لیے کتاب نکالیں گے کہ جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا ﴿وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا﴾۔

واضح ہے کہ "کتاب" سے مراد انسان کے نامہ اعمال کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے ۔ وہی نامہ اعمال کہ جو اس دنیا میں بھی موجود ہے کہ جس میں اس کے اعمال ثبت ہوئے ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ یہاں وہ نامہ اعمال پوشیدہ اور وہاں کھلا ہوا سامنے رکھا ہوگا ۔ "نخرج"' (نکالیں گے) اور "منشور" (کھلا ہوا) کی تعبیر اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس جہان میں مخفی ہے وہاں آشکار اور کھلا ہوا ہوگا ۔

نامہ اعمال اور اس کی حقیقت کے بارے میں آئندہ صفحات میں ہم مزید گفتگو کریں گے ۔

تو اس وقت اس سے کہا جائے گا: اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے﴿اقْرَأْ كِتَابَكَ﴾ ۔ اپنا حساب کتاب کرنے کے لیے آج تو خود ہی کافی ہے ﴿كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾)

یعنی مسائل اس قدر واضح ہیں کہ جائے کلام نہیں ہے ۔جو شخص بھی اس نامہ اعمال کو دیکھے گا خود فیصلہ کر سکے گا، چاہے وہ خود مجرم ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ نامہ اعمال خود اسی کے اعمال یا اعمال کے آثار کا مجموعہ ہے لہٰذا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا انکار ہو سکے ۔

اگر میں اپنی ریکارڈ شدہ آواز سنوں یا کوئی اچھا یا برا کام کرتے ہوئے کھینچی گئی اپنی تصویر دیکھوں تو کیا اسکا انکار کر سکتا ہوں ۔ نامہ اعمال کی کیفیت روز قیامت اس سے بھی زیادہ اضح اور باریک تفصیلات کے ساتھ ہوگی۔

اگلی آیت میں حساب اور جزاء کے بارے میں چار اصولی احکام بیان کیے گیے ہیں :

۱۔ جو شخص ہدایت پالے تو اس نے اپنے ہی فائدے میں ہدایت پائی ہے اور اس کا نتیجہ خود اسی کو حاصل ہوگا ﴿مَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ﴾ ۔

۲۔ اور جو شخص گمراہی کا راستہ اپنا لے تو وہ اپنے ہی نقصان میں گمراہ ہوا ہے اور اس کے برے نتائج خود اسی کے دامن گیر ہوں گے

﴿وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا﴾ ۔

ان دو احکام کی نظیر اسی سورت کی ساتویں آیت میں بھی گزر چکی ہے ۔

۳۔ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے دوش پر نہیں اٹھائے گا اور کسی کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دی جائے گی ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾

"وزر" کا معنی ہے "بھاری بوجھ" یہ لفظ مسئولیت اور جوابدہی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ روحانی اعتبار سے یہ بھی انسان کے کندھے پر ایک بھار بوجھ کی مانند ہی ہے "وزیر" کو بھی اسی لیے "وزیر" کہتے ہیں کہ سربراہ مملکت یا عوام کی طرف سے اس کے کندھے پر ایک بھاری بوجھ ہوتا ہے ۔ یہ ایک عمومی قانون ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا ۔

البتہ یہ قانون سورہ نحل کی آیت ۲۵ کے مفہوم کے منافی نہیں ہے کہ جس میں ہے کہ گمراہ کرنے والے افراد سے ان لوگوں کے بارے میں بھی جوابدہی ہوگی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا ہے کیونکہ دوسروں کو گمراہ کرنا بھی بذات خود گناہ ہے یا گمراہ کرنے والے مثل فاعل شمار ہوں گے لہٰذا در حقیقت یہ ان کے اپنے گناہوں کا بوجھ ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہاں "سبب" کام انجام دینے والے کے حکم میں ہے ۔

متعدد روایات کے مطابق جو اچھی یا بری رسم کی بنیاد رکھے گا وہ جزا اور سزا میں اس رسم کی پیروی کرنے والوں کا شریک ہے ۔ جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے یہ روایات اس سے متضاد نہیں ہیں کیونکہ کسی سنت یا رسم کی بنیاد رکھنے والا در حقیقت عمل کے بنیادی اسباب میں سے ہے اور عمل میں شریک ہے ۔

۴۔آخر میں چوتھا حکم یوں بیان کیا گیا ہے: ہم کسی شخص یا قوم کو اس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک ان کے لیے کوئی پیغمبر مبعوث نہ کریں تا کہ وہ پوری طرح انہیں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرکے ان پر حجت تمام کردے ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ ۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہاں عذاب سے مراد ہر قسم کا دنیاوی یا اخروی عذاب ہے یا خصوصیت سے "عذابِ استیصال" ہے (یعنی طوفان نوح کی طرح کا ہولناک عذاب) ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم مطلق ہے اور اس میں ہر قسم کا عذاب شامل ہے ۔

نیز اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہ حکم شرعی مسائل کہ جنہیں نقلی دلائل سے معلوم کیا جاتا ہے کے لیے مخصوص ہے یا اصولی و فرعی اور عقلی و نقلی تمام مسائل سے مربوط ہے ۔ البتہ اگر ہم آیت کے ظاہری مفہوم کو دیکھیں تو مطلق ہے ۔ لہٰذا کہنا چاہئے اصول و فروع دین سے مربوط تمام عقلی و نقلی احکام اس میں شامل ہے ۔

آیت کے ظاہری مفہوم کے لحاظ سے اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مسائل بھی جن کے بارے میں عقل مستقلاً اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ رکھتی ہے (مثلاً عدل کا اچھا ہونا اور ظلم کا برا ہونا) اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ان کے بارے میں

بھی کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک خدا کے پیغمبر نہ آئیں اور حکم نقل کے ذریعے حکم عقل کی تائید نہ کریں ۔ (غور کیجئے گا) ۔

لیکن یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ عقل جن امور کے بارے میں مستقل فیصلہ رکھتی ہے وہ بیان شرعی کے محتاج نہیں ہیں اور ایسے امور کے لیے حکم عقل اتمام حجت کے لیے کافی ہے لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم مستقلات عقلی کو اس آیت سے مستثنیٰ سمجھیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو پھر عذاب کے اس جملے میں عذابِ استیصال کا معنی لینا ہوگا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف اور کرم کی وجہ سے ظالموں اور منحرفوں کو اس وقت تک نابود نہیں کرے گا جب تک انہیں سعادت کی تمام راہیں بتانے والا پیغمبر ان میں مبعوث نہ کرے ۔ وہ پیغمبر ان سے مستقلات عقلی کے بارے میں بھی شرعی حکم بیان کرے گا اور عقل و نقل دونوں حوالوں سے اتمام حجت کرے گا (غور کیجئے گا) ۔

چند اہم نکات

۱۔ اچھی اور بری فال:

کسی چیز یا کام سے نیک و بد فال لینا تمام قوموں میں تھا اور آج بھی ہے۔یوں لگتا ہے کہ اس کا سرچشمہ حقائق تک دسترس نہ ہونا اور واقعات کے اسباب و علل سے لا علمی ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ نیک یا بد فال کا کوئی طبیعی اثر نہیں ہے البتہ اس کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ لیکن فال امید آفریں ہوتی ہے جبکہ بد فال یاس، ناامیدی اور کمزوری کا موجب بنتی ہے۔ اسلام چونکہ ہمیشہ اچھی چیزوں کا خیر مقدم کرتا ہے اس لیے اسلام نے نیک فال سے منع نہیں کیا، البتہ بد فال کی شدید مذمت کی ہے۔یہاں تک کہ بعض روایات میں اسے سرحد شرک میں شمار کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

الطيرة شرک

بری فال لینا(اور خدا کے مقابلے میں اسے اپنی قسمت میں موثر جاننا) ایک قسم کا خدا کی ذات میں شرک کرنا ہے۔

اس سلسلے میں چھٹی جلد میں ہم سورہ اعراف میں آیت ۱۳۱ کے ذیل میں گفتگو کر چکے ہیں۔یہ بات جاذب نظر ہے کہ صحیح اور اصلاح پہلووں سے اس قسم کے تخیلاتی امور سے اسلام نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

مثلاً عموماً کہا جاتا ہے کہ فلاں دلہن خوش قدم تھی یا بَد قدم تھی۔جس دن سے اس نے فلاں شخص کے گھر میں قدم رکھا ہے وہ ایسا ہو گیا ہے۔ یہ ایک فضول بات سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اسلام نے اسے تعمیری اور اصلاحی شکل دی ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:من شوم المرئة غلاء مهرها وشدة مئونته----

عورت کی ایک نحوست یہ ہے کہ اس کا حق مہر زیادہ ہو اور اخراجات بھاری ہوں ----[۱]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ(ص) وسلم سے منقول ہے:

اما الدار فشومها ضيقها وخبث جيرانها

منحوس گھر وہ ہے کہ جو تنگ وتاریک ہو اور جس کے ہمسائے برے لوگ ہوں۔[۲]

خوب غور کریں کہ وہی الفاظ جنہیں لوگ غلط اور بے ہودہ مفاہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں انہیں حقیقی اور اصلاح مفاہیم کے لیے صرف کیا گیا ہے اور بے راہ روی کی طرف جانے والے خیال و افکار کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔

اس بحث کی موید رسول صلی اللہ علیہ وآلہ(ص) وسلم کی ایک حدیث پر ہم اپنی اس گفتگو کو ختم کرتے ہیں ۔ آپ فرماتے ہیں:اللّٰھم لاخیر الّا خیرک، ولا طیر الّا طیرک ولا رب غیرک

بار الہا!خیر وہی ہے جو تیری طرف سے ہوا اور کوئی اچھی بری فال تیرے ارادے کے بغیر کچھ نہیں اور تیری علاوہ کوئی رب نہیں ۔

۲۔ انسان کا عجیب اعمال نامہ:

قرآن حکیم کی بہت سی آیات اور روایات میں انسانوں کے نامہ اعمال کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ۔ مجموعی طور پر ان آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ایک رجسٹر میں لکھے جاتے ہیں اور اگر انسان نیک ہوا تو روز قیامت اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اگر برا ہوا تو بائیں ہاتھ میں ۔

سورہ حاقہ میں ہے:﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِیَ کِتَابَهُ بِیَمِینِهِ فَیَقُولُ هَاؤُمْ اقْرَئُوا کِتَابِی﴾

جسے اس نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا فخر سے کہے گا کہ آئیے اور ہمارا نامہ اعمال پڑھیے ۔ (حاقہ۔۱۹)

نیزیہ بھی فرمایا ہے:﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِیَ کِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَیَقُولُ یَالَیْتَنِی لَمْ أُوتَ کِتَابِی﴾

لیکن جسے اس نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا وہ کہے گا: اے کاش! میرنامہ اعمال مجھے نہ تھمایا جاتا ۔ (حاقہ۔ ۲۵)

سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہے:﴿وَوُضِعَ الْکِتَابُ فَتَرَی الْمُجْرِمِینَ مُشْفِقِینَ مِمَّا فِیهِ وَیَقُولُونَ یَاوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْکِتَابِ لَایُغَادِرُ صَغِیرَةً وَلَاکَبِیرَةً إِلاَّ أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَایَظْلِمُ رَبُّکَ أَحَدًا﴾

بنی آدم کے اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اس کی تحریر سے خوف کھائیں گے اور کہیں گے! ہائے ہم پر افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی چھوٹا بڑا گناہ شمار کیے بغیر نہیں چھوڑا گیا اور جو کچھ انہوں نے انجام دیا تھا اسے موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا ۔

ایک حدیث میں زیر بحث آیت "اقرء کتابک ---" کے ذیل میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:یذکر العبد جمیع ما عمل، وما کتب علیه، حتی کانه فعله تلک الساعة، فلذلک قالوا یا ویلتنا ما لهٰذا الکتاب لایغادر صغیرة ولا کبیرة الّا أحصاه۔

جو کچھ انسان انجام دے چکا ہے اور اس کے نامہ اعمال میں درج ہے سبب کچھ اسے یاد آجائے گا اور اس طرح سے کہ جیسے اس نے ابھی ابھی انجام دیا ہے لہٰذا مجرمین پکاریں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ جس نے کوئی چھوٹا بڑا گناہ لکھے بناء نہیں چھوڑا ۔ (۳)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نامہ اعمال کیا ہے اور کیسا ہے ۔ظاہر ہے کہ وہ عام کتاب، یا رجسٹر یا فائل کی طرح کا تو نہیں ہوگا ۔ اس لیے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ نامہ اعمال "روح انسان" کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے کہ جس میں تمام اعمال کے آثار ثبت ہیں ۔ (۴) کیونکہ ہم جو بھی عمل انجام دیتے ہیں وہ لازمی طور پر ہماری روح پر اثر مرتب کرتا ہے ۔ یا یہ کہ یہ نامہ اعمال ہمارے جسم کے اعضاء اور گوشت پوست اور اس کے گرد کی زمین، ہوا اور فضا ہے کہ جس میں ہم اعمال انجام دیتے ہیں کیونکہ ہمارے اعمال ہمارے جسم پر اثرات مرتب کرنے کے علاوہ ہوا اور زمین پر بھی اثر چھوڑتے ہیں اگرچہ اس دنیا میں ہم ان آثار کو محسوس کر نہیں سکتے لیکن بلاشبہ وہ موجود ہوتے ہیں اور روز قیامت کہ جب ہمیں ایک نئی قوت ادراک حاصل ہوگی، ہم دیکھ سکیں گے ۔

سطورِ بالا میں جو تفسیر بیان ہوئی ہے اس کے بارے میں لفظ "اقرأ" (پڑھ) سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ پڑھنے کا بھی ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر قسم کا مشاہدہ شامل ہے ۔ مثلاً روزمرہ کی گفتگو میں ہم کبھی کبھی کہتے ہیں :"میں نے اس کی آنکھوں سے پڑھ لیا ہے کہ اس کا ارادہ کیا ہے" یا "فلاں آدمی کے فلاں کام سے میں نے باقی بات پڑھ لی ہے ۔" اسی طرح بیماروں کے ایکس رے کو دیکھنے کے لیے بھی پڑھنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ اس کے نامہ اعمال کے مندرجات کسی طرح بھی قابلِ انکار نہیں ہیں کیونکہ وہ خود عمل کے حقیقی اور تکوینی آثار ہیں ۔بالکل انسان کی ٹیپ شدہ آواز کی طرح اور یا اس کی انگلی کے نشان کی طرح۔

۳۔ گنگار کے ساتھ بے گناہ نہیں جلے گا:

عوام میں مشہور ہے کہ جب آگ لگتی ہے تو خشک و تر سب کچھ جل جاتا ہے ۔ لیکن منطق، عقل اور تعلیمات انبیاء کے مطابق کسی بے گناہ کو کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے سزا نہیں ملے گی قوم لوط کے تمام شروں میں صرف ایک گھر ایمان والوں کا تھا ۔ جب اللہ نے اس منحرف اور غلیظ قوم پر عذاب نارل کیا تو اس ایک گھرانے کو بچا لیا ۔

زیر بحث آیات میں بھی صراحت سے فرمایا گیا ہے:ولا تزر وازرة وزر اخری

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ دوسرے کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا ۔

اس بناء پر اگر کچھ غیر معتبر روایات میں اسلام کے کلی قانون کے خلاف کچھ نظر آئے تو اسے لازمی طور پر ایک طرف پھینک دینا چاہیئے یا اس کی توجیہ کی جانا چاہیئے ۔ مثلاً ایک روایت میں ہے:

مرجانے والے کو اس کے پسماندگان کی گریہ و زاری کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے ۔

ہوسکتا ہے یہاں عذاب سے عذاب الٰہی مراد نہ ہو بلکہ اس سے وہ ناراحتی اور دکھ مراد ہو کہ جو اس کی روح کو اپنے عزیزوں کی بے تابی و اضطراب سے آگاہ ہونے پر ہوتا ہے ۔

نیز اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ کہ کافروں کی اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ جہنم میں جائے گی، ایک اسلامی عقیدہ نہیں ہے ۔ کیونکہ اولاد کو ماں باپ کے گناہ کی سزا نہیں مل سکتی یہی وجہ ہے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ غیر شرعی طور پرپیدا ہونے والی اولاد کا بھی ذاتی طور پر کوئی گناہ نہیں اور اگر وہ چاہے تو سعادت و نجات کے دروازے اس کے سامنے کھلے ہیں اگرچہ ایسی اولاد کے لیے تربیت کا مسئلہ بہت دشوار ہے ۔

۴۔ برائت کا اصول اور آیت "﴿ما کنا معذبین﴾":

علمِ اصول میں "برائت "کی بحث میں زیر نظر آیت سے استدال کیا گیا ہے کیونکہ آیت کا کم از کم مفہوم یہ ہے کہ جن مسائل کا عقل ادراک نہیں کرسکتی، انبیاء بھیجے بغیر یعنی احکام اور ذمہ داریاں بیان کیے بغیر خدا کسی کو سزا نہیں دے گا ۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ جن امور کے بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے ان پر کوئی سزا نہ ہوگی۔ اس کو قانونِ برائت کہتے ہیں یعنی حکم بیان کیے بغیر سزا صحیح نہیں ہے ۔

باقی رہا یہ معاملہ کہ بعض نے کہا ہے کہ زیر نظر آیت میں عذاب سے مراد صرف عذابِ استیصال ہے جیسا قومِ نوح پر آیا تھا، تو اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں آیت مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں ہر قسم کا عذاب اور سزا شامل ہے ۔

۱۔ وسائل الشیعہ، ج۳، ص۱۰۴۔

۲۔ سفینۃ البحار، ج۱، ص۶۸۰۔

۳۔ نور الثقلین، ج۳، ص۱۴۴۔

۴۔ تفسیر صافی۔

آیات ۱۶،۱۷

۱۶ ﴿وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِکَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا﴾

۱۷ ﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ وَكَفىٰ بِرَبِّکَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا﴾

ترجمہ

۱۶۔ اور جب ہم کسی شہر کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے "مترفین" (نفس پرستی میں مست دولت مندوں) سے اپنے اوامر بیان کرتے ہیں۔ پھر جب وہ مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں تو ہم شدت سے ان کی سرکوبی کرتے ہیں۔

۱۷۔ اور ایسے کتنے ہی لوگ تھے جو نوح کے بعد کی صدیوں میں رہے اور (اسی سنت کے مطابق) ہم نے انہیں ہلاک کردیا۔ اور کافی ہے تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ اور ان کے لیے بینا ہے۔

عذاب الٰہی کے چارہ مرحلے

گزشتہ آیات میں سے آخری میں بیان کیا گیا تھا کہ "ہم کسی فرد یا گروہ کو انبیاء بھیجنے اور اپنے احکام بیان کرنے کے بغیر ہرگز سزا نہیں دیتے"۔ اب زیر بحث پہلی آیت میں ہی بنیادی بات ایک اور پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب ہم کسی قوم کو ہلاک کرنے کا مصمم ارادہ کرلیتے ہیں تو پہلے ہم مترفین اور دولت کے نشے میں غرق لوگوں سے اپنے احکام بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ اطاعت نہیں کرتے بلکہ مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں تو ہم ان کی شدت سے سرکوبی کرتے ہیں اور انہیں ہلاک کردیتے ہیں ﴿وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِکَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا﴾۔ [1]

اس آیت کے مفہوم کے بارے میں بہت سے مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن ہماری نظر میں آیت ظاہری معنی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ واضح تفسیر نہیں رکھتی۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اتمام حجت اور اپنے احکام بیان کرنے سے پہلے ہرگز کسی سے مواخذہ نہیں کرتا اور نہ کسی کو عذاب دیتا ہے بلکہ پہلے اپنے احکام بیان کرتا ہے اگر لوگ اطاعت کریں اور ان احکام کو اپنا لیں تو خوب، اسی میں ان کی دنیا و آخرت کی سعادت ہے اور اگر وہ فسق و فجور کریں اور مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں اور احکام کو پاؤں تلے روند ڈالیں تو یہ وہ مقام ہے جہاں وہ عذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں اور پھر اس کے بعد ان کے لیے ہلاکت ہے۔

اگر آیت میں صحیح طور پر غور و فکریں تو اس کام کے لیے چار مراحل واضح طور پر بیان ہوئے ہیں:

(۱) اوامر (و نواھی) کا مرحلہ

(۲) مخالفت تور فسق و فجور کا مرحلہ

(۳) عذاب کے استحقاق کا مرحلہ

(۴) ہلاکت ما مرحلہ

فاء تفریح کے ساتھ یہ تمام مرحلے دوسرے پر عطف ہوئے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ صرف "مترفین"[۲] کو حکم کیوں دیا گیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو معاملہ واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے معاشروں (مراد غلط قسم کے معاشرے ہیں) میں معاشرے کی باگ ڈور مترفین ہی کے قبضے میں ہوتی ہے اور لوگ ان کے تابع اور پیرو ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ معاشرے کی زیادہ تر برائیوں کا سرچشمہ مترفین اور خدا کو بھولے ہوئے دولت مندہی ہوتے ہیں جو نازد نعمت، عیش و عشرت اور ہوا و ہوس میں مستغرق ہوتے ہیں۔ ہر اصلاحی، انسانی اور اخلاقی آواز انہیں بُری لگتی ہے۔ لہذا یہی لوگ انبیاء کے مقابلے میں پہلی صف میں ہوتے تھے اور ان کی دعوت کہ جو عدل و انصاف کے لیے اور مستضعفین کی حمایت میں ہوتی تھی اسے ہمیشہ اپنے بر خلاف سمجھتے تھے۔ ان وجوہ کی بناء پر خصوصیت سے انہی کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ فساد اور برائی کی اصلی جڑیہی لوگ ہیں۔

ضمنا۔ "دمرنا" اور "تدمیر"، "دمار" کے مادہ سے ہلاکت کے معنی میں ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت تمام اہل ایمان کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ خبردار رہیں اور اپنی حکومت مترفین اور نفسانی خواہشوں میں سرمست دولت مندوں کے ہاتھ میں نہ دیں اور ان کے پیچھے نہ لگیں کیونکہ یہ لوگ آخر کار ان کے معاشرے کو ہلاک و نابودی سے ہمکنار کریں گے۔

اس کے بعد والی آیت میں اس مسئلے کے کئی ایک نمونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کتنے ہی لوگ تھے جو نوح کے بعد کی صدیوں میں آئے اور (اسی سنت کے مطابق) ہلاک اورنابود ہوگئے﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ﴾

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی فرد یا گروہ کا ظلم اور گناہ علم خدا کی تیز بین نگاہ سے مخفی رہ جائے "خدا اپنے بندوں کے گناہ سے کافی یعنی پورا آگاہ ہے ان کے لیے بینا ہے" ﴿وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا﴾

"قرون" "قرن" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے وہ لوگ جو ایک زمانے میں زندگی گزاریں۔ بعد ازاں یہ لفظ ایک زمانے اور ایک دَور کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ایک "قرن" کتنے سال کا ہوتا ہے، اس سلسلے میں مختلف نظریات ہیں۔ بعض چالیس سال کا کہتے ہیں، بعض اَسّی سال کا، بعض سو سال کا اور بعض اس سے بھی زیادہ، ایک سو بیس سال کا کہتے ہیں۔ لیکن بنا کہے واضح ہے کہ یہ ایک امر اعتبار ہے جو مختلف صورتوں میں مختلف ہوتا ہے البتہ ہمارے زمانے میں معمول یہ ہے کہ لفظ "قرن" کا اطلاق سو سال پر ہوتا ہے۔ [۳]۔

نیز یہ کہ نوح علیہ السلام کے بعد کے قرنوں کا خصوصی ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اس لیے ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے انسانی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ یہ سب اختلاف خصوصاً معاشرے کی "مترف" اور "مستضعف" کی طبقاتی تقسیم بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بہت کم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔

"خبیر" و "بصیر" (آگاہ و بینا) کا اکٹھا ذکر اس طرف اشارہ ہے کہ "خبیر" نیت اور عقیدے سے آگاہ کے معنی میں ہے اور "بصیر" اعمال و کردار کو دیکھنے والے کے معنی ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ لوگوں کے اعمال کے باطنی وجود اور اسباب پر بھی مطلع ہے اور خود اعمال کو بھی جانتا ہے اور ایسی ہستی ہرگز کسی پر ظلم روا نہیں رکھتی اور اس کی حکومت میں کسی کا حق صنائع نہیں ہوتا۔

۱۔ "قول" کا لفظ اگرچہ وسیع معنی ہے لیکن ایسے موقع پر حکم، عذاب کے معنی میں ہے۔

۲۔ "مترفین" "ترفہ" کے مادہ سے فراواں نعمت کے معنی میں ہے یعنی وہ نعمتوں کے پلے ہوئے اور دولت مند جو خدا سے بے خبر ہیں۔

۳ سورہء یونس کی آیت ۱۳ کے ذیل میں بھی ہم نے اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے (تفسیر نمونہ، ج۸، ص۱۹۸ اردو ترجمہ)۔

آیات ۲۱،۲۰،۱۹،۱۸

۱۸ ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا﴾

۱۹ ﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾

۲۰ ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا﴾

۲۱ ﴿انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا﴾

ترجمہ

۱۸۔ جو شخص (صرف) جلد گزر جانے والی (مادی دنیا) طلب کرتا ہے تو ہم اسے اس قدر دے دیتے ہیں، جو ہم چاہیں اور جس مقدار کا اس کے بارے میں ارادہ کریں اس کے لیے دوزخ قرار دیں گے کہ وہ اس کی جلادینے والی آگ میں جلے گا (جبکہ وہ درگاہ الٰہی سے) راندہ اور مذموم ہوگا۔

۱۹۔ اور جو شخص صرف آخرت کو چاہے اور اپنی سعی اور تلاش اس کے لیے انجام دے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو (خدا کی طرف سے) اسے اس وتلاش جزا ملے گی۔

۲۰۔ ان میں سے ہر گروہ کو تیرے پروردگار کی عطا میں سے حصہ اور مدد ملے گی اور تیرے پروردگار کی عطا و بخشش کبھی کسی سے ممنوع قرار نہیں دی گئی۔

۲۱۔ دیکھو کس طرح ہم نے بعض کو (دنیا میں ان کی سعی اور تلاش کی وجہ سے) بعض دوسروں پر برتری عطا کی ہے اور آخرت کے درجات اور اس کی فضیلتیں تو اس کہیں زیادہ ہیں۔

طالبان دنیا اور طالبان آخرت

گزشتہ آیات میں اوامرِ الٰہی کے مقابلے میں منکرین کی مخالفت اور پھر ان کی ہلاکت کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں اس سرکشی اور طغیان کے حقیقی سبب یعنی حبّ دنیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں کی نظر اسی زود گزر مادّی دنیا پر ہے، ہم جس مقدار میں چاہتے ہیں اور اس کے لیے مناسب سمجھتے ہیں اسی زندگی میں اسے دے دیتے ہیں، اس کے بعد اس کے لیے ہم جہنم قرار دیں گے کہ جس کی آگ میں وہ جلے گا اس حالت میں کہ وہ رحمت الٰہی کی درگاہ سے راندہ اور مذموم ہوگا ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا﴾

"عاجلة"کا معنی ہے جلد گزر جانے والی نعمتیں یا زود گزر دنیا ۔
یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص دنیا کے پیچھے جائے گا، وہ جو کچھ چاہے گا اس تک پہنچ جائے گا بلکہ اس کے لیے دو شرطیں بیان کی گئی ہیں پہلی یہ کہ وہ جو چاہے گا اس کا کچھ حصہ اسے ملے گا، اتنا ہی جتنا ہم چاہیں گے(ما نشاء) ۔

دوسری یہ کہ سب لوگ بھی یہ حصہ نہیں پا سکیں گے، بلکہ ان میں سے کچھ متاع دنیا کے ایک حصے تک پہنچیں گے وہی کہ جن کے بارے میں ہم چاہیں گے﴿لمن نرید﴾ ۔
اس طرح نہ تمام دنیا پرست دنیا تک پہنچیں گے اور نہ ہی پہنچ پانے والے اتنی دنیا حاصل کر سکیں گے جتنی وہ چاہیں گے ۔
روزمرہ کی زندگی میں بھی ہم اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔کتنے لوگ شب و روز دوڑتے رہتے ہیں لیکن کہیں نہیں پہنچتے اور کتنے افراد ہیں جو اس دنیا میں بڑی بڑی آرزوئیں رکھتے ہیں مگر ان میں سے کچھ ہی کی تکمیل ہوتی ہے ۔
یہ امر دنیا پرستوں کے لیے تنبیہ ہے کہ اگر تم خیال کرتے ہو کہ آخرت کو دنیا کے بدلے بیچ کر اپنا مقصد حاصل کر لوگے تو یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہے ۔ ایسا کبھی نہ ہوسکے گا ۔ مقصد کا کچھ حصہ ہی تمہیں ملے گا ۔
ویسے بھی انسان کی آرزوؤں کا دامن اتنا وسیع ہے کہ محدود عالم مادہ میں وہ سب پوری نہیں ہو سکتیں ۔ ایک شخص کو ساری دنیا مل جائے تو بھی اکثر وہ سیر نہیں ہوتا ۔
رہے وہ لوگ کہ جو کوششیں کرتے ہیں مگر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا، تو اس کی کئی وجوہ ہیں ۔ یا تو اس لیے کہ ابھی ان کی بیداری اور نجات کی امید ہوتی ہے اور خدا ان سے محبت کرتا ہے اور یا اس وجہ سے کہ اگر وہ کچھ حاصل کر لیں تو اس قدر سرکشی کریں گے کہ مخلوق خدا پر عرصہ حیات تنگ کریں گے ۔
"یصلی" "صلی" کے مادہ سے آگ روشن کرنے اور آگ میں جلنے کے معنی میں ہے ۔یہاں دوسرا معنی مراد ہے ۔
یہ بات قابل توجہ ہے کہ سزا کے طور پر جہنم کی آگ کے ساتھ "مذموم" اور "مدحور" کے الفاظ بھی تاکید کے طور پر آئے ہیں ۔ ان میں سے پہلی سزا سرزنش اور مذمت ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری خدا سے دور رہنے کے معنی میں ہے ۔ در حقیقت جہنم کی آگ تو ان کے لیے جسمانی سزا ہے اور مذموم و مدحور ہونا ان کے لیے روحانی عذاب ہے ۔ کیونکہ معاد جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی، اس کا عذاب و ثواب اور سزا جزا کے بھی دونوں پہلوں ہیں ۔

اس کے بعد دوسرے گروہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں تا کہ قرآن کی روش کے مطابق تقابل سے مطلب زیادہ آشکار ہو جائے۔

ارشاد ہوتا ہے: باقی رہا وہ شخص جو آخرت طلب کرتا ہے اور اسی راستے میں سعی و کوشش کرتا ہے اور وہ صاحب ایمان ہے تو اس کی سعی و کوشش بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگی﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾

لہٰذا جاودانی سعادت اور دائمی خوش بختی تک پہنچے کے لیے تین بنیادی شرائط ہیں:

(۱) انسانی ارادہ۔ ایسا ارادہ جو حیات ابدی سے تعلق رکھتا ہو اور زود گزر لذات، ناپائندہ نعمات اور نرے مادی مقاصد سے تعلق نہ رکھنا۔ بلند ہمت اور اعلیٰ جذبہ اسے قوت دینے والا ہو۔ اور یہ جذبہ و ہمت اسے ہر غیر الٰہی وابستگی اور تعلق سے آزاد کردے۔

(۲) یہ ارادہ فکر و نظر، تصور اور روح میں کمزور و ناتوان نہ ہو بلکہ ایسا ہو کہ وجود انسانی کے سبب ذرات کو حرکات میں لائے اور انسان اپنی تمام تر کوشش صرف کردے (توجہ رہے کہ لفظ "سعیھا" جو تاکید کے طور پر آیا ہے، نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنی حتمی کوشش کہ جو آخرت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے، انجام دیتا ہے اور کوئی ------دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتا)۔

(۳) یہ سب امور ایمان کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ ایمان کہ جو استوار اور پختہ ہو کیونکہ مصمم ارادہ اور کوشش جب ہی ثمر آور ہوگی جب اس کا سرچشمہ صحیح جذبہ ایمان باللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ آخرت کے لیے کوشش ایمان کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ایمان کا مفہوم اس میں پوشیدہ ہے لیکن اس راہ میں چونکہ ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لہٰذا اس سلسلے میں دلالت التزامی پر قناعت نہیں کی گئی اور ایمان کو بالصراحت کے شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ دنیا پرستوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے لیے ہم جہنم قرار دیں گے لیکن آخرت کے عاشقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان کی سعی و کوشش مشکور ہوگی یعنی پروردگار اس کا تشکر اور قدردانی کرے گا۔ اس کی نسبت کہ کہا جائے "ان کی جزا بہشت ہوگی" یہ مذکورہ تعبیر بہت زیادہ جامع اور بلند تر ہے کیونکہ ہر شخص کے لیے تشکر اور قدردانی اس کی شخصیت کی وسعتِ وجودی کے مطابق ہوتی ہے نہ کہ عمل کی مقدار کے مطابق۔ اس لحاظ

سے خدا کا شکر اور قدردانی اس کی لامتناہی ذات کی مناسب سے ہے ۔ انواع و اقسام کی مادی و معنوی نعمتیں اور وہ سب کچھ جو ہمارے تصور میں آسکتا ہے، اس میں جمع ہے ۔

بعض مفسرین نے ”مشکور“ کا معنی ”کئی گناہ اجر“پ بیان کیا ہے اور بعض نے اس سے ”مقبولیتِ عملیمراد لیا ہے لیکن واضح ہے کہ ”مشکور“ ان سے وسیع تر معنی رکھتا ہے ۔

ممکن ہے یہاں یہ توہم ہو کہ دنیا کی نعمتیں دنیا پرست لوگوں کا حصہ ہیں اور طالبانِ آخرت اس سے محروم ہیں ۔ اس تو ہم کو دُور کرنے کے لیے بعد والی آیت کہتی ہے: ہم اس گروہ کو یعنی ان میں سے ہر ایک کو اپنی عطا و بخشش کا حصہ دیں گے اور اس کی مدد کریں گے ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَؤُلَاء وَهَؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّکَ﴾ ۔ کیونکہ پروردگار کی بخشش کسی سے ممنوع نہیں ہے ۔ یہودی و نصاریٰ، مومن و مسلمان سب اس کے خوانِ نعمت سے حصہ پاتے ہیں ۔

”نمد“ ”امداد“ کے مادہ سے زیادہ کرنے کے معنی میں ہے ۔

اسکے بعد والی آیت اس سلسلے میں ایک بنیادی امر بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ جس طرح اس دنیا میں کوشش مختلف ہو تو نتیجہ مختلف ہو جاتا ہے اخروی امور میں بھی پوری طرح یہ بنیاد کارفرما ہے ۔ فرق یہ ہے کہ دنیا محدود ہے اور یہاں کا فرق بھی محدود ہے لیکن آخرت چونکہ لا محدود ہے لہٰذا وہاں فرق بھی لا محدود ہو گا ۔

ارشاد ہوتا ہے: دیکھو کس طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض دوسروں پر (ان کی کوشش میں اختلاف کی وجہ سے) برتری دیتے ہیں البتہ آخرت کے درجات زیادہ بڑے ہیں اور اس کی برتری و فضیلت بھی بہت زیادہ ہے ﴿انظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلىٰ بَعْضٍ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا﴾ ۔

ہو سکتا ہے کہا جائے کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ افراد بغیر کسی کوشش کے بہت سے فوائد حاصل کر لیتے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ استثنائی مواقع ہیں ۔ سعی و کوشش کو عمومی بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور یہی کامیابی کی میزان ہے اس کے مقابلے میں ان استثنائی مواقع کی پرواہ نہیں کی جا سکتی اور نہ یہ استثنائی مسئلہ عمومی و کلی بنیاد کے منافی ہے ۔ ضمنی طور پر توجہ رہے کہ کوشش سے مراد فقط اس کی مقدار نہیں ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑی سی کوشش بہت سی کوششوں کے مقابلے میں اپنی کیفیت کہ وجہ سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا دنیا و آخرت میں تضاد ہے؟:

بہت سی آیات میں دنیا اور اسی کے مادّی و مسائل کی تعریف کی گئی ہے۔ بعض آیات میں مال دنیا کو "خیر" کہا گیا ہے (بقرہ۔ ۱۸۰)۔ بہت سی آیات میں مادی نعمتوں کو "فضل اللہ "کہا گیا ہے۔ مثلاً:﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللهِ﴾

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾

دنیا کی تمام نعمتیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے۔

بہت سے آیات انہیں "﴿سَخَّرَ لَكُمْ﴾" (انہیں تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے) کے حوالے سے ان کا ذکر آیا ہے۔ اگر ہم ان آیات کو جمع کریں کہ جن میں مادی وسائل کی تعریف کی گئی ہے تو آیات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے۔ لیکن مادی نعمات کو اس قدر اہمیت دینے کے باوجود ایسے الفاظ آیات قرآن میں وجود ہیں جن میں ان کی تحقیر و تذلیل کی گئی ہے:

ایک مقام پر اسے متاع فانی شمار کیا گیا ہے:﴿تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾

ایک جگہ اسے غرور غفلت کا سبب قرار دیا گیا ہے:﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلاَّ مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾

ایک موقع پر اسے لہو و لعب اور کھیل کود کا ذریعہ شمار کیا گیا ہے:﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلاَّ لَهْوٌ وَلَعِبٌ﴾

نیز ایک مقام پر اسے یادخدا سے غفلت کا سبب گردانا گیا ہے:﴿رِجَالٌ لاَتُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلاَبَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ﴾

یہی دو قسم کی تعبیرات روایات اسلامی میں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک رُخ سے دنیا آخرت کی کھتی ہے، مردانِ خدا کا مرکز تجارت ہے، دوستان حق کی مسجد ہے، وحی پروردگار کے نزول کا مقام ہے اور پند و نصیحت کا گھر ہے۔

امیر المومنین علی السلام فرماتے ہیں: مسجد أحباء الله ومصلى ملائكة الله وم٠بط وحى الله ومتجر أولياء الله۔[۱]

جبکہ دوسری طرف اسے یاد خدا غفلت کا سبب اور متاع غرور وغیرہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دو طرح کی آیت و روایات ایک دوسرے سے متضاد ہیں؟

اس سوال کا جواب خود قرآن سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن جہاں دنیا داور اس کی نعمتوں کی مذمت کرتا ہے تو اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کا مقصد فقط یہی زندگی ہے۔ سورہ نجم کی آیہ ۲۹ میں ہیں:

﴿وَلَمْ يُرِدْ إِلاَّ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾

وہ لوگوں کہ جو دنیاوں زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتے ۔

دوسرے لفظوں میں یہاں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہے جو دنیا کے بدلے آخرت کو بیچ دیتے ہیں اور مادّی خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی قسم کی غلط کاری اور جرم سے نہیں چوکتے ۔

سورہ توبہ آیہ ۳۸ میں ہے:﴿أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾

کیا تم آخرت کے بدلے دنیا وی زندگی قبول کرنے پر راضی ہو گئے ہو؟

زیر بحث آیات خود اس دعوی کی شہادت دیتی ہیں ۔ فرمایا گیا ہے:﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ﴾

یعنی ان کے پیش نظر یہی زود گزر مادّی زندگی ہے ۔

اصولی طور پر کھیتی یا مزکر تجارت و غیرہ کے الفاظ خود اسی پر زندہ شاہد ہیں ۔

مختصر یہ کہ مادّی دنیا کی نعمتیں سب کی سب اللہ کی نعمتیں ہیں ۔ ان کا وجود نظام خلقت میں یقیناً ضروری تھا اور ہے ۔ اگر انسان ان سے سعادت اور روحانی کمال تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھ کر استفادہ کرے تو یہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے ۔ لیکن اگر وسیلے کی بجائے انہی کو مقصد سمجھ لیا جائے اور انہیں معنوی اور انسانی قدروں سے الگ کر لیا جائے تو فطرتاً یہ امر غرور، طغیان، سرکشی، ظلم اور بیدادگری کا سبب ہوگا ۔ ایسی دنیا یقیناً ہر قسم کی برائی کا محل قرار پائے گی اور قابل مذمت ٹھہرے گی۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس پُر مغزدار اور مختصر سے جملے میں کیا خوب فرمایا ہے:

من ا بصر بها بصرته ومن البصر اليها ا عمته

جو اس کے ذریعے چشم بصیرت سے دیکھے تو دنیا اسے آگہی بخشتی ہے اور خود دنیا کی طرف دیکھے تو یہ اسے اندھا کردیتی ہے ۔ (۲)

در حقیقت مذموم اور ممدوح دنیا میں وہی فرق ہے جو "الیها" اور "بها"میں ہے ۔پہلی صورت میں دنیا مقصد ہے اور دوسری صورت میں دنیا وسیلہ ہے اور کسی اور تک پہنچے کا ذریعہ ہے ۔

۱۔ نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، جملہ ۱۳۱-

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ۳۸-

۲۔ کامیابی میں کوشش کا دخل:

یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ قرآن کوشش کا ذکر کرتے ہوئے سست اور بیکار افراد کو تنبیہ کررہا ہے اور نہیں بیدار کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ دوسری جہان کی سعادت وخوش بختی صرف اظہار ایمان اور گفتار سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ سعادت وخوش بختی کا حقیقی عامل کوشش اور جستجو ہے۔

یہ حقیقت بہت سی قرانی آیات سے معلوم ہوتی ہے۔ذیل کی آیت میں انسان کو اپنے اعمال کا گیروی قرار دیا گیا ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے کہ انسان کا حصّہ وہی کچھ ہے جو وہ کوشش کرتا ہے:

﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلاَّ مَا سَعىٰ﴾

بہت سی آیات قرآن میں ایمان کا ذکر کرنے کے بعد عمل صالح کا ذکر کیا گیا ہے۔تاکہ یہ خیال خام ذہن سے نکل جائے کہ کوشش کے بغیر بھی کسی مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔جب مادّی دنیا کی نعمات کوشش کے بغیر حاصل نہیں جا سکتی تو کیسے جاسکتی ہے کہ سعادت جاودانی اس کے بغیر ہاتھ لگ جائے گی۔

۳۔ امدادالٰہی:

"نمد" "امداد" کے مادہ سے مدد دینے کے معنی میں ہے۔مفردات میں راغب کہتا ہے:

لفظ "امداد" عام طور پر مفید اور مؤثر کمک کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "مد" ناپسندیدہ کمک کے لیے۔

بہر حال زیر بحث آیات کے مطابق خدا تعالیٰ اپنی نعمتوں کا کچھ حصہ تو سب کو دیتا ہے اور نیک اور بد سب اس سے استفادہ کرتے ہیں یہ نعمتوں کے اس حصے کی طرف اشارہ ہے جس پر دنیاوی زندگی کے بقا موقوف ہے اور جس کے بغیر کوئی باقی رہ سکتا۔

دوسرے لفظوں میں خدا کا وہی مقام رحمانیت ہے جس کا فیض مومن و کافر کے لیے عام ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ایسی لا متناہی نعمتیں ہیں جو صرف مومنین اور نیک لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

آیات ۲۲،۲۳،۲۴،۲۵

۲۲ ﴿لَاتَجْعَلْ مَعَ اللهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَخْذُولً﴾

۲۳ ﴿وَقَضَى رَبُّکَ أَلاَّ تَعْبُدُوا إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ کِلاَهُمَا فَلَاتَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَاتَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا کَرِيمًا﴾

۲۴ ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّيَانِی صَغِيرًا﴾

۲۵ ﴿رَبُّکُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِی نُفُوسِکُمْ إِنْ تَکُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ کَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا﴾

ترجمہ

۲۲۔ اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دے ورنہ مذموم و رسوا ہو جائے گا ۔

۲۳۔تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی ذرہ بھر اہانت بھی نہ کرو اور انہیں جھڑکو نہیں اور کریمانہ انداز سے لطیف و سنجیدہ گفتگو کرو۔

۲۴۔ اور لطیف و محبت سے ان کے سامنے خاکساری کا پہلو جھکائے رکھو۔ اور کہو۔ پروردگارا! جیسے انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما ۔

۲۵۔تمہارا پروردگار تمہارے دلوں کے نہاں خانہ سے آگاہ ہے(اگر تم نے اس سلسلے میں کوئی لغزش کی ہوا اور پھر اس کی تلافی کردی ہو تو وہ تمہیں معاف کردے گا کیونکہ)اگر تم صالح اور نیک ہوگے تو وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا ہے ۔

اہم اسلامی احکام کا سلسلہ

توحید اور ماں باپ سے حسن سلوک

زیر نظرِ آیات اسلامی احکام کے ایک سلسلے کا آغاز ہیں یہ سلسلہ توحید اور ایمان سے شروع ہوتا ہے توحید تمام مثبت اور اصلاحی کاموں کے اسباب کا خمیر ہے ۔توحید سے احکام کے بارے میں گفتگو شروع کرکے ان آیات کا گزشتہ آیات سے تعلق باقی رکھا گیا ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں ایمان، کوشش اور دار آخرت کا ارادہ رکھنے کے بارے میں گفتگو تھی۔

نیز یہ اس امر کی بھی تاکید ہے کہ قرآن صاف ترین اور بہترین راستہ کہ طرف دعوت دینے والا ہے ۔

توحید کے ذکر سے بعد شروع کرتے ہوئے قران کہتا ہے:"اللہ " خدائے یگانہ کے ساتھ کوئی معبود قرار نہ دے﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللهِ إِلٰهًا آخَرَ﴾۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ خدا کے ساتھ دوسرے معبود کی پرستش نہ کرو بلکہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دو۔ یہ بات زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی عقیدے میں، عمل میں، دعا میں اور پرستش میں۔ کسی حالت میں بھی اللہ کے ساتھ کسی اور کہ معبود قرار نہ دو۔ اس کے بعد شرک کا ہلاکت انگیز نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:اگر تم اس کے لیے شریک کے قائل ہوگئے تو مذمت اور رسوائی میں ڈوب جاؤ گے﴿فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَخْذُولًا﴾۔

لفظ "قعود"(بیٹھ جانا) یہاں ضعف و ناتوامی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عربی ادب میں لفظ ضعف کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "قعد به الضعف عن القتال"

ناتوانی کی وجہ سے دشمن سے جنگ کرنے سے بیٹھ گیا۔

مذکورہ بالا جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک انسان میں تین بہت برے اثر مرتب کرتا ہے۔

(۱)شرک ضعف وناتوانی اور ذلت و زبوں حالی کا سبب ہے جبکہ قیام، حرکت اور سرفرازی کا عمل ہے۔

(۲)شرک مذمت و سرزنش کا سبب ہے کیونکہ یہ ایک واضح انحرافی راستہ ہے، منطقِ عقل کا انکار ہے نعمتِ پروردگار کا واضح کفران ہے۔ جو شخص ایسا انحراف اختیار کرے وہ قابلِ مذمت ہے۔

(۳)شرک مشرک کو اس کے بنائے معبودوں کے پاس چھوڑ دیا ہے اور خدا اس کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ بناوٹی معبود بھی چونکہ کسی کہ مدد کرنے کے قابل نہیں اور خدا بھی ان افراد کی مدد ترک کردیتا ہے تو وہ "مخذول" یعنی بے یار و مددگار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ قرآن کی دوسری آیات میں بھی یہی مفہوم کسی اور شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ سورہ عنکبوت کی آیہ ۴۱ میں ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾غیر خدا کو اپنا معبود بنانے والوں کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے کمزور اور بے بنیاد گھر کو اپنا سہارا بنا رکھا ہے اور کمزور ترین گھر مکڑی کا ہے۔

توحید کے بعد اس پر تاکید کے ساتھ انبیاء کی انسانی تعلیمات میں سے ایک انتہائی بنیادی تعلیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: "تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو "﴿وَقَضَی رَبُّکَ أَلاَّ تَعْبُدُوا إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾

"قضاء" "امر" کی نسبت زیادہ تاکید کا مفہوم رکھتا ہے اور قطعی و محکم فرمان کا معنی دیتا ہے۔ یہ لفظ اس مسئلے میں پہلی تاکید ہے۔

توحید۔ کہ جو اسلام کی عظیم ترین بنیاد ہے، ماں باپ سے نیکی کرنے کو اس کے ساتھ قرار دینا اس اسلامی حکم کی اہمیت کے لیے دوسری تاکید ہے۔

لفظ "احسان" یہاں مطلق ہے۔ اس میں ہر قسم کی نیکی کا مفہوم مضمر ہے۔ یہ اس معاملے پر تیسری تاکید ہے۔ اسی طرح لفظ "والدین" کا اطلاق مسلمان اور کافر دونوں پر ہوا ہے۔ یہ اس مسئلے پر چوتھی تاکید ہے۔

لفظ "احساناً" یہاں نکرہ صورت میں ہے جو ایسے مواقع پر بیان عظمت کے لیے آتا ہے۔ یہ پانچویں تاکید ہے(۱)۔

بعض کا نظریہ ہے کہ "احسان" عام طور پر "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے "احسن الیہ" (اس سے احسان کیا" اور کبھی "باء" کے ذریعہ متعدی ہوتا ہے۔ یہ تعبیر شاید دیکھ بھال کرنے کا معنی دینے کے لئے ہو، یعنی ذاتی طور پر بغیر کسی واسطے کے ماں باپ سے حُسنِ سلوک اور احترام و محبت کا مظاہرہ کرو، یہ اس مسئلے کے لئے چھٹی تاکید ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ حکم عمومی عموماً امر اثباتی کے لیے ہوتا ہے حالانکہ یہاں نفی پر ہے (تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو) ہوسکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ لفظ "قضیٰ" سے سمجھے جاتا ہے کہ دوسرا جملہ اثباتی شکل میں مقدر ہے اور معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے:

تیرے پروردگار نے تاکیدی حکم دیا ہے کہ اس کی پرستش کرو، اس کہ غیر کی نہ کرو۔

یا یہ کہ نفی اور اثبات پر مشتمل یہ جملہ "﴿أَلاَّ تَعْبُدُوا إِلاَّ إِيَّاهُ﴾" ایک اثباتی جملے کی حیثیت رکھتا ہے یعنی پروردگار کے لیے عبادت منحصر ہے کا اثبات۔

اس کہ بعد ماں باپ سے حسن سلوک کا ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے: جب ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے تک پہنچ جائیں اور شکستہ سِن ہوجائیں (اس طرح سے انہیں تیری طرف سے مستقل دیکھ بھال کی

احتیاج ہو) تو ان کے لیے کسی طرح سے محبت میں دریغ نہ کرنا اور ان کی تھوڑی سی بھی اہانت نہ کرنا یہاں تک کہ خفیف سا غیر مؤدبانہ لفظ "اُف" تک منہ سے نہ نکالنا ﴿إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَاتَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ﴾۔ [1]

انہیں جھڑک نہ دینا اور ان کے سامنے بلند آواز نہ بولنا ﴿وَلَاتَنْهَرْهُمَا﴾۔ بلکہ سنجیدہ، لطیف کریمانہ شریفانہ انداز سے کلام کرنا ﴿وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا کَرِيمًا﴾۔

اور تنہائی عجز و انکساری سے ان کے سامنے پہلو جھکائے رکھنا ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾۔ اور کہو: پروردگارا اپنی رحمت ان کے شامل حال کر جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں پرورش کی ہے ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِی صَغِيرًا﴾۔ بعض دوسروں کے بقول "ان" شرطیہ اور "ما" زائدہ سے مرکب ہے جو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لفظ شرط اس فعل پر آسکے جو نون تاکید سے مؤکد ہے۔ (المیزان)

۱۔ "إِمَّا يَبْلُغَنَّ" میں "إِمَّا" بعض کے بقول "ان" شرطیہ اور "ما" شرطیہ کا مرکب ہے جو کہ تاکید کے لئے یکے بعد دیگرے آئے ہیں۔ (تفسیر فخر الدین رازی)

ماں باپ کا انتہائی احترام

گزشتہ دو آیات میں اولاد کے لیے ماں باپ کا انتہائی ادب و احترام بیان کیا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں مختلف پہلو قابل غور ہیں :

(۱) ایک توان کے عالمِ پیری کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب وہ زیادہ توجہ، محبت اور احترام کے محتاج ہوتے ہیں ۔ فرمایا گیا ہے کہ ان سے ذرہ بھر اہانت آمیز بات نہ کرو کیونکہ ہوسکتا ہے بڑھاپے کی وجہ سے اس عالم کو پہنچ چکے ہوں کہ ادب دوسرے کی مدد کے بغیر چل پھر نہ سکتے ہوں اور نہ اپنی جگہ سے اٹھ سکتے ہوں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ گندگی بھی اپنے سے دور نہ کر سکتے ہوں ۔ ایسی حالت میں اولاد کی بہت بڑی آزمایش شروع ہوجاتی ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس حالت میں اولاد ماں باپ کے وجود کو رحمت سمجھتی ہے یا مصیبت، کیا ایسے میں کافی صبر و حوصلہ کے ساتھ ماں باپ کی پورے احترام سے نگہداشت کرتی ہے یا گھٹیا اور اہانت آمیز الفاظ کے ساتھ انہیں زبان کے نشتر چبھوتی ہے، یا یہاں تک کہ بعض اوقات خدا سے ان کی موت کا تقاضا کر کے انہیں اذیت پہنچاتی ہے ۔

(۲) قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس موقع پر انہیں "اف" تک نہ کہو یعنی ناراحتی، پریشانی اور تنفر کا اظہار نہ کرو۔ قرآن مزید کہتا ہے کہ ان سے بلند اور اہانت آمیز آواز سے بات نہ کرو۔ مزید تاکید کرتا ہے کہ ان سے کریمانہ اور شریفانہ لہجے میں کلام کرو۔ یہ سب چیزیں انتہائی ادب سے گفتگو کرنے کے بارے میں ہیں کیونکہ دل کی کلید زبان ہے ۔

(۳) نیز قرآن عجز و انکساری کا حکم دیتا ہے ۔ ایسی انکساری جس سے محبت اور لگاؤ ظاہر ہو نہ کہ کوئی اور چیز۔

(۴) نیز آخر میں یہ تک کہتا ہے کہ جب بارگاہ خداوندی کا رخ کرو تو (وہ زندہ ہو یا نہ) انہیں فراموش نہ کرو اور ان کے لیے رحمت پروردگار کا تقاضا کرو۔

اس تقاضے کے ساتھ خصوصیت سے یہ دلیل رکھو کہ خداوندا! جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تو بھی ویسے ہی اپنی رحمت ان کے شاملِ حال فرما ۔

دیگر چیزوں کے علاوہ اس سے یہ اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ماں باپ اس قدر ناتواں ہوجائیں کہ تنہا چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں اور گندگی اپنے سے دور نہ کر سکیں تو پھر بھی انہیں فراموش نہ کرو کیونکہ تم بھی بچپن میں اسی طرح تھے اور وہ تمہاری حفاظت اور تجھ سے محبت میں کوئی دریغ نہ کرتے تھے لہذا ان کی محبت کا جواب ویسی ہی محبت سے دو۔

نیز ممکن ہے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی ، ان کا احترام اور ان کے سامنے انکساری کے معاملے میں اولاد سے جان بوجھ کریا لا علمی میں کچھ لغزشیں ہو جائیں لہٰذا زیرِ بحث آخری آیت میں قرآن کہتا ہے: جو کچھ تمہارے دل میں ہے پروردگار اس سے زیادہ آگاہ ہے﴿بُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِى نُفُوسِكُمْ﴾ ۔

کیونکہ اس کا علم تمام پہلوؤں سے حضور، ثابت اور ازلی و ابدی ہے اور ہر طرح سے غلطی اور اشتباہ سے پاک ہے جبکہ تمہارا علم ان صفات کا حامل نہیں ہے لہٰذا اگر تم سے سرکشی کی ارادے کے بغیر حکمِ الٰہی کے خلاف ماں باپ کے احترام اوران سے حُسنِ سلوک میں کوئی لغزش ہوجائیں اور تم فوراً پشیمان ہوکر توبہ و تلافی کا رُخ کرو تو یقینا رحمت الٰہی تمھارے شاملِ حال ہوگی۔" اگر تم صالح اور نیک ہو اور توبہ کرتے ہو، کیونکہ خدا توبہ کرنے ولوں کو بخشنے والا ہے "﴿إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا﴾

"أَوّاب" "أَوب" (برِوزن "قَوم") کے مادہ سے ہے ۔ یہ اس بازگشت کو کہتے ہیں جس میں ارادہ شامل ہو جبکہ "رجوع" بھی بازگشت کو کہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ارادہ بھی اس میں شامل ہو۔ اسی بناء پر "توبہ" کو "اوبہ" کہا جاتا ہے کیونکہ توبہ در حقیقت خدا کی طرف ارادے کے ساتھ بازگشت ہے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ صیغہ مبالغہ کا ذکر خدا کی طرف بازگشت اور رجوع کے متعدد عوامل کی طرف اشارہ ہو کیونکہ :

(۱) پروردگار پر ایمان،

(۲) قیامت کی عدالت کی طرف توجہ،

(۳) بیداری ضمیر اور

(۴) گناہ کے اواقب و آثار کی طرف توجہ

یہ چاروں باہم مل کر انسان کو تاکید در تاکید کے ذریعے کج روی سے نکال کر خدا کی طرف لے جاتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ منطقِ اسلام میں والدین کا احترام:

اگرچہ انسانی جذبات اور حق شناسی والدین کی احترام گزاری کے لئے کافی ہے لیکن اسلام ایسے امور میں بھی خاموشی روا نہیں رکھتا جن میں عقل، جذبات اور طبعی میلانات واضح رہنمائی کرتے ہیں بلکہ ایسے امور بھی اسلام تاکید کے طور پر ضروری احکام صادر کرتا ہے۔

والدین کے احترام کے بارے میں اسلام نے اس قدر تاکید کی ہے کہ اتنی تاکید بہت کم کسی مسئلہ میں کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چندایک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(۱) قرآن مجید میں چار سورتوں میں مسئلے توحید کے فوراً بعد والدین سے حسن سلوک کا حکم آیا ہے۔ ان دونوں مسائل کا اکٹھا بیان ہونا اس امر کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کس حدتک ماں باپ کے احترام کا قائل ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۸۳میں ہے:﴿اتَعْبُدُونَ إِلاَّ اللهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾

سورہ نساء کی آیت ۳۶ میں ہے:﴿وَاعْبُدُوا اللهَ وَلاَتُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾

سورہ، انعام کی آیت ۱۵۱ میں ہے:﴿أَلاَّ تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾

اور زیر بحث آیات میں بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کا ہم قرین قرار دیا گیا ہے:

﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلاَّ تَعْبُدُوا إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾

(۲) اس مسئلے کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ قرآن میں بھی اور روایات میں بھی صراحت سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ماں باپ کافر ہوں تب بھی ان کا احترام بجالانا ضروری ہے۔ سورہ لقمان کی آیت ۱۵ میں ہے۔

﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلاَتُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾

اگر وہ تجھ سے اصرار کریں کہ تُو مشرک ہو جاتو اُن کی اطاعت نہ کر لیکن دنیا دی زندگی میں ان سے اچھا سلوک کر۔

(۳) قرآن مجید میں ماں باپ کے سامنے اظہار تشکر کا ذکر نعمات الٰہی کے شکریے کے ساتھ آیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:﴿أَنْ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾

اگرچہ خدا کی نعمتوں کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ امر ماں باپ کے حقوق کی عظمت اور وسعت کی دلیل ہے۔

(۴) قرآن نے ماں باپ کی ذرہ بھر بے احترام کی اجازت نہیں دی۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لو علم اللہ شیئاً ھو ادنیٰ من أف لنھی عنہ، وھو من أدنی العقوق، ومن العقوق أن ینظر الرجل الی والدیہ فیحدّ النظر الیھم۔

کوئی چیز "اف" [۱] سے بھی کم ہوتی تو خدا اس سے بھی روکتا بھی بے احترامی میں شامل ہے [۲]

(۵) با وجودیکہ جہاد ایک نہایت اہم اسلامی حکم ہے، جب تک واجب عینی نہ ہو یعنی اتنے افراد کافی تعداد میں وجود ہوں کہ جو اپنی خواہش سے جہاد پر جائیں تو جہاد کی نسبت ماں باپ کی خدمت میں رہنا زیادہ اہم ہے اور اگر جانا ان کی پریشانی اور بے آرامی کا سبب بنے تو نا جائز ہے۔

امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

ایک شخص پیغمبر اکرم کی خدمت میں آیا۔

اُس نے عرض کیا: میں ایک خوش و خرم اور طاقتور نوجوان ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ جہاد میں حصہَ لوں لیکن میری ماں ہے جو اس سے ناراحت ہوتی ہے۔

اس کی اس بات پر رسول اللہ نے فرمایا: ارجع فکن مع والدتک فوا الذی یعثنی بالحق بک لیلة خیر من جھاد فی سبیل اللہ سنة۔

لوٹ جاؤ اور اپنی ماں کے پاس رہو۔ قسم ہے اس خدا کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ایک رات کہ جس میں تیری ماں تجھ سے خوش رہے ایک سال جہاد سے بہتر ہے [۳]

البتہ جس وقت جہاد وجوب عینی کی صورت اختیار کر لے اور اسلامی ملک خطرے میں ہوا اور سب کا حاضر ہونا ضروری ہو تو پھر کوئی عذر قابل قبول نہیں یہاں تک کہ ماں باپ کی ناراضگی بھی لیکن واجبات کفائی کے موقع پر اسی طرح مستحبات میں مسئلہ اسی طرح ہے جیسا جہاد کے موقع پر کہا گیا ہے۔

(٦) پیغمبر اکرم نے فرمایا:

ایّاکم وعقوق الوالدین فان ریح الجنة توجد من سیرة الف عام ولایجدھا عاق۔

اس سے بچو کہ ماں باپ تمہیں عاق کردیں اور ان کے ناراض ہونے سے بچو کیونکہ جنت کی خشبو ایک ہزار سال کی مسافت تک پہنچتی ہے لیکن ایسا شخص کبھی بھی یہ خشبو نہیں سونگھ سکتا کہ جو ماں باپ کا عاق کردہ اور نافرمان ہو۔ (۴)

یہ تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد نہ صرف جنت میں قدم نہیں رکھ سکیں گے بلکہ اس سے بہت دور ہوں گے اور اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکیں گے۔

سید قطب اپنی تفسیر فی ظلال میں پیغمبر اکرم سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

ایک شخص طواف میں مشغول تھا۔ اس نے اپنی ماں کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور اسے طواف کروارہا تھا۔ تو رسول اللہ نے اسے اس حالت میں دیکھا۔ اس نے عرض کیا: کیا یہ کام کرکے میں نے اپنی ماں کا حق ادا کردیا؟ آپ نے فرمایا: نہیں یہاں تک کہ تو نے (وضع حمل کے وقت کی) ایک آہ کا بدلہ نہیں دیا۔ (۵)

اگر ہم قلم کو آزاد چھوڑدیں تو گفتگو بہت لمبی ہوجائے گی اور بات تفسیر سے آگے بڑھ جائے گی لیکن ہم صراحت سے کہتے ہیں کہ اس سلسلے کی جس قدر بھی گفتگو کریں تھوڑی ہے کیونکہ والدین انسان پر حق حیات رکھتے ہیں۔

اس بحث کی آخر کیں ہم اس نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ کوئی غیر منطقی یا خلاف شریعت بات کرتے ہیں تو واضح ہے کہ کسی ایسے موقع پر ان کی اطاعت واجب اور امر بالمعروف کیا جائے۔

اس سلسلے گفتگو کو ہم امام کاظم علیہ السلام کی ایک حدیث پر تمام کرتے ہیں۔ امام فرماتے ہیں:

کوئی شخص رسول اللہ کے پاس آیا اور اس نے باپ اور بیٹے کے حق کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا:

لایسمه باسمه، ولا یمشی بین یدیه، ولا یجلس قبله، ولا یستسب له-

باپ کو اس کے نام سے نہ پکارے (بلکہ کہے: ابا جان، وغیرہ)، اس کے آگے آگے نہ چلے، اس سے پہلے نہ بیٹھے اور کوئی کام ایسا نہ کرے کہ لوگ اس کے باپ کو گالیاں دیں اور برا بھلا کہیں۔ (یعنی یہ نہ کہیں کہ خدا تیرے باپ کو نہ بخشے کہ تو نے یہ کام کیا ہے، وغیرہ)۔ (۶)

۲۔ "قضاء" کے معنی کے بارے میں تحقیق:

"قضیٰ" "قضاء" کے مادی سے کسی چیز کو عمل یا گفتگو سے جدا کرنے کے معنی میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ در اصل کسی چیز کو ختم کرنے کے معنی ہے۔ یہ دونوں معانی قریب الافق ہیں۔

ختم کرنا اور جدا کرنا چونکہ وسیع مفہوم رکھتے ہیں لہذا یہ لفظ مختلف مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کے چھ معانی ذکر کیے ہیں :

(۱) "قضاء" بمعنی حکم اور فرمان۔ مثلاً:﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلاَّ تَعْبُدُوا إِلاَّ إِيَّاهُ﴾

تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کہ علاوہ کس کی عبادت نہ کر۔

(۲) "قضیٰ" خلق کرنے کے معنی میں۔ مثلاً:﴿فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ﴾

خدا نے جہان کو ادوار میں سات آسمانوں کی شکل میں خلق کیا۔ (حٰم السجدہ۔ ۱۲)

(۳) "قضیٰ" فیصلے کے معنی میں: مثلاً:﴿فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ﴾

جو فیصلہ کرنا چاہتے ہو کرو۔ (طٰہٰ/۷۲)

(۴) "قضاء" کسی چیز سے فراغت کے معنی میں۔ مثلاً:﴿قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ﴾

جس کام کے بارے میں تم نظریہ یا فتویٰ دینا چاہتے تھے وہ ختم ہوگیا۔ (یوسف/ ۴۱)

(۵) "قضی" ارادہ کے معنی میں مثلاً:﴿إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾

جس وقت ہم نے موسی سے عہد و پیمان لیا۔ (آل عمران/۴۷)

نیز ابوالفتوح رازی نے "قضیٰ" کا معنی خبر دینا اور اعلان کرنا بھی لکھا ہے مثلاً:﴿إِذْ قَضَيْنَا إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ﴾

ہم نے بنی اسرائیل کو تورات میں خبر دی۔ (قصص/۴۴)(۲)

ان معانی میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ "قضاء" موت کے معنی میں بھی ہے مثلاً:﴿فَوَكَزَهُ مُوسَى فَقَضَى عَلَيْهِ﴾

موسی نے اسے ضرب لگائی اور وہ مرگیا۔ (قصص/۱۵)

یہاں تک کہ بعض مفسرین نے قرآن مجید میں "قضاء" کے تیرہ سے بھی زیادہ معانی سمجھے ہیں۔ (۷)

لیکن ان سب کو لفظ "قضاء" کے مختلف معانی نہیں سمجھنا چاہیئے یہ سب ایک قدر مشترک رکھتے ہیں جس میں سب جمع ہیں۔ در حقیقت زیادہ تر معانی جو سطور بالا میں ذکر کیے گئے ہیں "اشتباہِ مصداق بمفہوم" کے قبیل سے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک کلی اور جامع معنی کا مصداق ہے یعنی ختم کرنا اور الگ کرنا۔

مثال کے طور پر قاضی اپنے فیصلے کے ذریعے دعوی ختم کرتا ہے۔ پیدا کرنے والا اپنی تخلیق کے ذریعے کسی چیز کی خلقت کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ خبر دینے والا اپنی خبر کے ذریعے کسی چیز کا بیان آخر تک پہنچاتا ہے۔ عہد و پیمان کرنے والا اور حکم دینے والا اپنے عہد و پیمان اور حکم کے ذریعے مسئلے کو اس طرح تمام کرتا ہے کہ اب اس میں بازگشت ممکن

نہیں ہے ۔ البتہ بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان بعض مصادیق میں یہ اس طرح سے استعمال ہوا ہے کہ ایک نیا سا معنی پیدا ہو گیا ہے مثلا" قضاء" فیصلہ کرنے اور حکم دینے کے معنی میں ۔

۳۔ "اف" کے معنی کی تحقیق:

راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "اُف" دراصل ہر کثیف اور آلودہ چیز کے معنی میں ہے اور توہین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اس لفظ کا صرف رسمی معنی نہیں ہے بلکہ اس سے فعل بھی بنایا جا سکتا ہے ۔ مثلاً کہتے ہیں :

افففت بکذ۔

یعنی۔ میں نے فلاں چیز کو آلودہ سمجھا اور اس سے اظہار نفرت کیا ۔

بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ "اُف" اور "تف" اصل میں وہ میل کچیل ہے جو ناخن کے نیچے جمع ہوجاتی ہے جو آلودہ بھی ہوتی ہے اور حقیر بھی۔یہاں تک کہ بعض نے "اُف" اور "تف" میں بھی فرق کیا ہے ۔ انھوں نے پہلے کو گوشت کی میل کچیل اور دوسرے کو ناخن کی میل سمجھا ہے ۔

بعد ازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر اس چیز کے لیے بولا جانے لگا جو ناراحتی اور تکلیف کا باعث ہو(۸)

"اُف" سے اور معانی بھی مراد لیے گئے ہیں، مثلاً تھوڑی سی چیز، ناراحتی، ملامت اور بدبو۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ اس لفظ کی بنیاد یہ ہے کہ جس وقت انسان کے بدن یا لباس پر مٹی یا تھوڑی سی راکھ بیٹھ جائے اوروہ پھونک سے اسے اپنے سے دور کرے تو اس موقع پر انسان کے منہ سے جو آواز نکلتی ہے وہ "اوف" یا "اُف" کے مشابہ ہوتی ہے ۔بعد ازاں یہ لفظ کی صورت میں ناراحتی اور تنفر کے اظہار کے لیے خصوصاً معمولی چیزوں کے بارے میں استعمال ہونے لگا ۔

جو کچھ اس سلسلے میں کہا گیا ہے اسے مجموعی نظر سے دیکھا جائے اور دیگر قرائن بھی ملحوظ نظر رکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں "اسم صوت" تھا(وہ آواز جو انسان نفرت، رنج اور تکلیف کے موقع پر نکلتا ہے یا کسی آلودہ چیز پر پھونک مارتے ہوئے اس کے منھ سے نکلتی ہے) ۔ بعد ازاں یہ آواز لفظ کی صورت اختیار کر گئی۔یہاں تک کہ اس سے الفاظ مشتق ہوئے اور یہ لفظ معمولی پریشانیوں یا چھوٹے چھوٹے مسائل پر اظہار تنفر کے لیے بولا جانے لگا ۔ لہٰذا اوپر جو مختلف معانی بیان ہوئے ہیں یوں لگتا ہے کہ وہ اسی جامع اور کلی کے مصداق ہیں ۔

بہرحال آیت چاہتی ہے کہ ایک مختصر سی عبارت میں انتہائی فصاحت و بلاغت سے یہ بات سمجھائے کہ ماں باپ کا احترام اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے سامنے ذراسی بھی ایسی بات نہ کی جائے جو ان کی ناراحتی یا تنفر کا باعث ہو۔

۱۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے "اُف" ناراحتی کا معمولی سا اظہار ہے۔

۲۔ جامع السعادات، ج۲، ص۲۵۸-

۳۔ جامع السعادات، ج۲، ص۲۶۰-

۴۔ جامع السعادات، ج۲، ص۲۵۷-

۵۔ فی ظلال، ج۵، ص۳۱۸-

۶۔ نور الثقلین، ج۴، ص۱۴۹-

۷۔ تفسیر قرطبی، ج۶، ص۳۸۵۳-

۸۔ تفسیر فخر الدین رازی، ج۲۰، ص۱۸۸-

آیات ۲۹،۲۸،۲۷،۲۶

۲۶ ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾

۲۷ ﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾

۲۸ ﴿وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَيْسُورًا﴾

۲۹ ﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا﴾

۳۰ ﴿إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا﴾

ترجمہ

۲۶۔ اور نزدیکیوں کو ان کا حق دے اور (اسی طرح) مسکین اور مسافر کا اور ہرگز اسراف اور فضولی خرچی نہ کر۔

۲۷۔ کیونکہ اسراف کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان نے اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفران کیا۔

۲۸۔ اور اگر تو ان (حاجت مندوں) سے اعتراض کرے اور تم اپنے پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہو (کہ وہ تیرے کام میں کشائش کرے اور تُو ان کی مدد کرے) تو ان سے تو نرم اور لطیف و کرم کے پیرائے میں بات کر۔

۲۹۔ کبھی بھی اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کا حلقہ نہ بنا (اور انفاق و بخشش کر ترک نہ کر) اور نہ ہی اسے بالکل کھول دے کہ (آخر کار) تو ملامت زدہ اور بے کار ہو کر رہ جائے۔

۳۰۔ تیرا پروردگار جسے چاہتا ہے اس کی روزی کشادہ کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کی روزی تنگ کردیتا ہے وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ و بینا ہے۔

انفاق و بخشش میں اعتدال

ان آیات میں اسلام کے بنیادی احکام کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں قریبیوں، حاجت مندوں اور مسکینوں کے حق کی ادائیگی کے بارے میں حکم ہے نیز انفاق میں فضولی خرچی سے روکا بھی گیا ہے

پہلے فرمایا گیا ہے: قریبیوں اور نزدیکیوں کا حق انہیں دے ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾۔ اسی طرح حاجت مندوں اور راہ میں رہ جانے والوں کا حق انہیں دے ﴿وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ﴾۔ لیکن اس طرح سے کہ ہرگز فضولی خرچی نہ ہو ﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾۔

"تبذیر" اصل میں "بذر" کے مادہ سے بیج ڈالنے اور دانہ چھڑکنے کے معنی میں ہے لیکن یہ لفظ ایسے مواقع سے مخصوص ہے جہاں انسان اپنے اموال کو غیر منطقی اور غلط کام میں خرچ کرے ۔ فارسی میں اس کا متبادل ہے "ریخت وپاش "۔دوسرے لفظوں میں "تبذیر" نامناسب مقام پر مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں چاہے تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو۔ بر محل مقام پر خرچ کرنے کو "تبذیر" نہیں کہتے چاہے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ(ص) نے اس آیت کے بارے میں سوال کرنے والے کے جواب میں فرمایا:

من أنفق شیئاً فی غیر طاعة الله فهو مبذّر ومن أنفق فی سبیل الله فهو مقتصد-

جو شخص حکم الٰہی اطاعت کے خلاف کہیں خرچ کرے وہ "مبذر" (فضولی خرچ) ہے اور جو شخص راہ خدا میں خرچ کرے وہ مقتصد (میانہ رو) ہے[۱] ۔

آپ ہی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ(ص) نے حاضرین کے لیے تروتازہ کھجوریں لانے کا حکم دیا ۔
بعض لوگ کھجور کھاتے اور ان کی گٹھلیاں دور پھینک دیتے ۔آپ(ص) نے فرمایا: ایسا نہ کرو "تبزیر" ہے اور خدا برائی کو پسند نہیں کرتا ۔ [۲]

اسراف اور تبذیر کا معاملے اتنا باریک ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ(ص) وسلم ایک راستہ سے گزر رہے تھے ۔ آپ کے ایک صحابی سعد وضو کر رہے تھے اور پانی زیادہ ڈال رہے تھے ۔ آپ نے فرمایا:

اسراف کیوں کرتے ہو؟

سعد نے عرض کیا:

کیا وضو کے پانی میں بھی اسراف ہے؟

آپ نے فرمایا:

نعم وان کنت علی نھر جار-

ہاں اگرچہ تم جاری دریا کے کنارے ہی کیوں نہ ہو۔ [۳]

اس سلسلے میں کہ "ذی القربیٰ" سے آنحضرت کے سب رشتہ دار مراد ہیں یا مخصوص رشتہ دار(کیونکہ آیت میں مخاطب آنحضرت ہی ہیں)، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے ۔

متعدد احادیث کہ جن کے بارے میں "چند اہم نکات" کے زیر عنوان بحث آئے گی، میں ہم پڑھیں گے کہ یہ آیت رسول اللہ کے "ذوی القربیٰ" سے تفسیر ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض احادیث میں ہے کہ یہ آیت آنحضرت کی طرف سے حضرت فاطمہ الزہرا اسلام اللہ علیہا کو فدک کا علاقہ بخشنے کے بارے میں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے ایسی تفسیر آیات کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں۔ در اصل ان میں روشن اور واضح مصداق کا ذکر ہوتا ہے۔

"وات" میں رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے لیکن یہ بات اس امر کی دلیل نہیں کہ حکم آنحضرت ہی سے مخصوص ہے۔ کیونکہ باقی احکام جو ان آیات میں آئے ہیں مثلاً فضولی خرچی کی ممانعت، سائل اور مسکین سے نرمی یا بخل کی ممانعت سب رسول اکرم سے خطاب کی صورت میں ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ احکام آپ سے مخصوص نہیں ہیں اور ان کا مفہوم طرح عام ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرنے کے حکم کے بعد فضولی خرچی کی ممانت اس طرف اشارہ ہے کہ کہیں انسان قرابت کے جذبات یا مسکین اور مسافر سے کسی جذباتی وابستگی کے زیر اثر نہ آجائے اور ان کے استحقاق سے زیادہ خرچ نہ کرے اور سرف کی راہ اختیار نہ کرے کیونکہ اسراف اور فضولی خرچی ہر مقام پر مذموم ہے۔

بعد والی آیت "تبذیر" کی ممانعت پر استدال اور تاکید کے طور پر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اسراف کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں ﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾۔

اور شیطان نے پروردگار کی نعمتوں کا کیسے کفران کیا تو اس کا جواب واضح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہت زیادہ قوت و استعداد دے رکھی تھی۔ اس نے ان سب قوتوں کو غلط مقام پر صرف کیا یعنی لوگوں کو گمراہ کیا۔

رہا یہ کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی کیسے ہیں؟ تو اس کو وجہ یہ ہے کہ وہ بھی خداداد نعمتوں کا کفران کرتے ہیں اور جہاں انہیں استعمال کرنا چاہئے وہاں کی بجائے انہیں غلط مقام پر خرچ کرتے ہیں۔

"اخوان" (بھائی) یا اس بناء پر ہے کہ ان کے اعمال شیطانوں سے اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے بھائیوں کے کہ جو ایک جیسے عمل کرتے ہیں اور یا اس بناء پر کہ وہ دوزخ میں شیطانوں کے ہم نشین ہوں گے جیسا کہ سورہ زخرف آیہ ۳۹ میں شیطان کا گناہوں سے آلودہ انسانوں سے بہت نزدیکی تعلق بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَنْ يَنفَعَكُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ﴾

آج شیطان سے اظہار برائت اور علیحدگی کا تقاضا تمہارے لیے سود مند نہیں ہے کیونکہ تم سب عذاب میں مشترک ہو۔

رہا یہ کہ "شیاطین" یہاں جمع کی صورت میں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ اس چیز کی طرف اشارہ ہو جو سورہ زخرف کی آیات سے معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص یاد خدا سے منہ پھیر لے ایک شیطان کو اس کا ہمنشین قرار دیا جاتا ہے جو نہ صرف اس جہاں میں اس کے ہمراہ ہوگا بلکہ اس جہان میں بھی ساتھ ہوگا۔ قرآن کے الفاظ میں:

﴿وَزُخْرُفًا وَإِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ، وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَانِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ، حَتَّى إِذَا جَائَنَا قَالَ يَالَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ﴾(زخرف/۳۶و۳۸)

بعض اوقات کوئی مسکین کسی کے پاس آتا ہے لیکن اس کی ضرورت کے مطابق اس کی مدد کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں اگلی آیت بتاتی ہے کہ ضرورت مندوں سے کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔

ارشاد ہوتا ہے:"اگر تو ان ضرورت مندوں سے (وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اور) رحمت کے انتظار میں ہونے کے باعث رُخ موڑے تو ایسا تحقیر اور بے حرمتی سے نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان سے نرم اور سنجیدہ گفتگو سے بڑی محبت سے پیش آنا چاہیئے۔" یہاں تک کہ اگر ہو سکے تو ان سے آئندہ کا وعدہ کرلے تا کہ وہ مایوس نہ ہوں ﴿وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَيْسُورًا﴾۔

"میسور" "یسر" کے مادہ سے راحت اور آسان کے معنی میں ہے۔یہاں یہ لفظ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی اچھی گفتگو اور محبت آمیز برتاؤ کا مفہوم شامل ہے۔ لہٰذا اگر بعض نے اس کی تفسیر کسی خاص عبارت سے کی ہے آئندہ کا وعدہ کرنا مراد لیا ہے تو یہ مصداق کی حیثیت رکھتا ہے۔

روایات میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد جب کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ مانگتا اور آپ کے پاس دینے کو کچھ نہ ہوتا تو فرماتے:یرزقنا اللہ وایاکم من فضلہ۔

میں امید رکھتا ہوں کہ خدا ہمیں اپنے فضل سے رزق دے گا۔ (۴)

ہمارے ہاں قدیمی طریقہ ہے کہ کوئی سائل گھر کے دروازے پر آئے اور اسے دینے کو کچھ نہ ہوتا تو کہتے ہیں: معاف کرو۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تیرے آنے سے ہمارے اوپر ایک حق عائد ہو گیا ہے اور تو اخلاقی طور پر ہم سے کچھ طلب کر رہا ہے۔ ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنا یہ اخلاقی حق ہمیں بخش دے کیونکہ ہم تمہارے حق کا تقاضا پورا نہیں کر سکتے۔

اعتدال چونکہ ہر چیز میں ضروری ہے یہاں تک کہ انفاق میں بھی، لہٰذا اگلی آیت میں اس بارے میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اپنے ہاتھ کا گردن کے گرد حلقہ نہ بنا﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ﴾۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دینے والا ہاتھ تیرے پاس ہونا چاہئے اسے بخیلوں کے ہاتھ کی طرح گردن کی زنجیر نہیں بن جانی چاہیے کہ انسان مدد کرنے کے قابل نہ رہے۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ "اپنا ہاتھ اتنا بھی کھلانا رکھ اور بخشش اتنی بھی بے حساب نہ کرکہ تو کام کاج سے رہ جائے اور کبھی اِس اور کبھی اُس کی ملامت سنتار ہے اور لوگوں سے جدا ہو جائے"﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾۔

جیسے ہاتھ کا گردن کے لیے حلقہ زنجیر بن جانا بخل کے لیے کنایہ ہے اسی طرح ہاتھ کا بالکل کھلا ہونا بے حساب بخشش کرکے بیٹھ رہنے اور بیکار ہوجانے کی طرف اشارہ ہے لفظ "تقعد" "قعود" کے مادہ سے بیٹھے کے معنی میں ہے۔

لفظ "ملوم" اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات زیادہ انفاق اور بخشش نہ صرف انسان کی فعالیت ختم کردیتی ہے اوراسے لوگوں کی ملامت کا بھی شکار کردیتی ہے۔

"محسور" "حسر" (بروزن "قصر") کے مادہ سے در اصل لباس اتار کر کچھ حصہ برہنہ کرنے معنی میں۔اسی بناء پر "حاسر" اس جنگجو کو کہتے ہیں جس کے بدن پر زِرہ اور سر پر خود نہ ہو۔نیز جانور جو زیادہ چلنے کی وجہ سے تھک کر رہ گئے ہوں انہیں بھی "حسیر" یا "حاسر" کہا جاتا ہے۔گویا ان کی جسمانی طاقت کا لباس اتر جاتا ہے اور وہ برہنہ ہو جاتے ہیں۔بعد ازاں اس لفظ مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر اس شخص کو جو تھکا ماندہ ہو اور مقصد تک پہنچنے سے عاجز ہو "حسیر" یا "حاسر" "محسور" یا "حسیر" یا "حاسر" کہا جانے لگا۔

لفظ "حسرت" (بمعنی غم واندازہ) اسی مادہ سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ حالت عام طور پر انسان پر ایسے عالم میں طاری ہوتی ہے جب وہ مشکلات کو ختم کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو گویا اس کی طاقت کا جامہ اتر گیا ہو۔

انفاق میں بھی انسان حد سے گزر جائے اور اس میں اپنی تمام قوت ہاتھ سے دے بیٹھے تو فطری امر ہے کہ وہ اپنی کار کردگی اور رکھنے اور زندگی کا سازدسامان مہیا کرنے سے رہ جاتا ہے گویا اس کی برطرف ہوجاتی ہیں اور وہ غم والم میں ڈوب جاتا ہے اور لوگوں سے بھی اس کا میل ملاپ منقطع ہوجاتا ہے ۔

بعض روایات جو اس آیت کی شان نزول میں منقول ہیں ۔ان میں یہ مفہوم وضاحت سے نظر آیا ہے ۔ایک روایات میں ہے :

رسول اللہ ایک گھر میں موجود تھے ۔اس گھر کے دروازہ ے پر ایک سائل آیا اسے دینے کے لیے کوئی چیز مہیا نہ تھی ۔اس نے قمیص مانگی تھی۔ رسول اللہ نے اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی ۔اس وجہ سے آپ اس روز مسجد میں نماز کے لیے نہ جا سکے ۔کفار نے اس مسئلے کو اچھا لا طرح طرح کی باتیں کرنے لگے ۔انہوں نے کہا، محمدؐ(ص) سو گیا ہے یا لہو ولعب میں مشغول ہے اور اس نے اپنی نماز بھلادی ہے ۔

اس طرح یہ کام دشمن کی علامت وشماتت کا سبب بھی بنا اور دوستوں کی جدائی کا بھی ۔یعنی "ملوم ومحسور"کا مصداق ہوا ۔اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوتی اور رسول اللہ سے کہا گیا کہ اس کام کا اعادہ نہ ہو ۔

یہ مسئلہ ظاہراً جس موقع پر مسئلہ ایثار سے متضاد ہے، اس کے بارے میں ہم "چند اہم نکات"کے زیر عنوان بحث کریں گے ۔

بعض نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعضی اوقات رسول اللہ بیت المال میں جو کچھ ہوتا کسی ضرورت مند کو دے دیتے ۔ بعد میں کوئی حاجت مند آتا تو پھر آپ کے پاس کچھ نہ ہوتا اور آپ کو شرمندگی محسوس ہوتی۔ ایسے میں بسا اوقات ضرورتمند شخص ملامت کرنے لگتا اور پیغمبر اکرم کے پاک دل کو آزردہ کرتا لہذا حکم دیا گیا کہ جو کچھ بیت المال میں ہو سارے کا سارا نہ دیا جائے اور نہ ہی سارا رکھ چھوڑا جائے تاکہ اس قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اصلاً بعض لوگ محروم، نیاز اور مسکین کیوں ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کے لیے خرچ کرنا ضروری ہے ۔ کیا بہتر نہ تھا کہ خدا تعالیٰ خود انہیں جس چیز کی ضرورت ہے دے دیتا تاکہ وہ اس کے محتاج نہ ہوتے کہ ان پر خرچ کیا جائے ۔

زیر نظر آخری آیت گویا اس سوال کا جواب ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا اپنی روزی جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ وبینا ہے﴿إِنَّ رَبَّکَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا﴾

یہ تمھارے لئے ایک آزمائش اور امتحان ہے ورنہ اس کے لئے ہر چیز ممکن ہے، وہاس طرح سے تمھاری تربیت کرنا چاہتا ہے ۔ وہ تم میں سخاوت اور فداکاری کے جذبے پروان چڑھانا چاہتا ہے وہ تمہارے اندر خود غرضی کا خاتمہ چاہتا ہے ۔

علاوہ ازیں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ اگر وہ بالکل بے نیاز ہوجائیں تو سرکشی کی راہ اختیار کرلیں ۔ ان کے لیے مصلحت اسی میں ہے کہ ان کو محدود طور پر روزی ملے کہ جس سے وہ فقر و فاقہ میں بھی بتلا نہ ہوں اور طغیان و سرکشی کی راہ بھی اختیار نہ کریں ۔

ان تمام امور سے قطع نظر انسانوں میں (معلول، معذور اور مجبور افراد کے علاوہ) رزق کی تنگی اور وسعت ان کی سعی و کوشش سے وابستہ ہے اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کشادہ کردیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے، اس کا یہ چاہنا اس کی حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جس شخص کی کوشش زیادہ ہے اس کا حصہ زیادہ ہو اور جس کی کوشش کم ہے اس کا حصہ کم ہو۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے گزشتہ آیات سے متعلق کے بارے میں ایک اور احتمال قبول کیا ہے وہ یہ کہ زیر نظر آخری آیت انفاق میں افراط و تفریط سے روکنے کے حکم کی دلیل کے طور پر آئی ہے ۔ فرمایا گیا ہے کہ یہاں تک کہ خدا اپنی اس قدرت و طاقت کے باوجود عطائے رزق میں اعتدال رکھتا ہے نہ اس طرح سے بخشا ہے کہ برائی اور سرکشی برپا ہوجائے اور نہ اس طرح تنگ کرتا ہے کہ لوگ زحمت و مصیبت میں پڑ جائیں یہ سب کچھ بندوں کے مفاد کے پیش نظر ہے لہٰذا حق یہی ہے کہ تم بھی خدائی اخلاق اپنا کر اعتدال کی راہ اختیار کرو اور افراط اور تفریط سے پرہیز کرو ۔ (۵)

۱۔ تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

۲۔ تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔ ۳۔ تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

۴۔ تفسیر مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔ ۵۔ المیزان، ج ۱۳، ص ۸۸۔

چند اہم نکات

۱۔ "ذی القربیٰ" سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟

"ذی القربیٰ" جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وابستہ اور نزدیکی افراد کے معنی میں ہے۔ مفسرین نے اس بارے میں بحث کی ہے کہ یہ لفظ یہاں مخصوص افراد کے لیے ہے یا عام ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ تمام مومنین و مسلمین مخاطب ہیں اور انہیں اپنے رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض دیگر کہتے ہیں کہ مخاطب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم ہیں اور آپ سے کہا گیا ہے کہ اپنے نزدیکیوں کو ان کا حق ادا کریں۔ مثلا خمس غنائم اور خمس سے باقی متعلقہ چیزوں میں سے اور کلی طور پر بیت المال میں جو ان کے حقوق ہیں وہ ادا کریں۔

متعدد روایات جو شیعہ اور سنی طرق سے نقل ہوئی ہیں ان کے مطابق جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو بلایا اور فدک کی سرزمین آپکو بخشش دی۔ (۱)

جب اس علاقے کے یہودیوں نے جنگ کیے بغیر ہتھیار ڈال دیئے اور انھوں نے اپنے تئیں آنحضرت کی خدمت میں پیش کردیا تو معتبر اسناد اور تواریخ کے مطابق آنحضرت نے یہ زمین حضرت فاطمہ زہر(ص) کو بخش دی لیکن آنحضرت کی رحلت کے بعد مخالفین نے اسے غصب کرلیا، سالہا سال تک یہ علاقہ ایک سیاسی حربے کے طور پر ان کے ہاتھ میں رہا لیکن بعض خلفاء نے اسے اولادِ فاطمہ(ص) کو واپس کردیا۔

(بعض تواریخ کے مطابق فدک کا علاقہ تقریباً دس مرتبہ چھینا گیا اور واپس کیا گیا)۔

اہل سنت کی منابع سے ایک حدیث مشہور صحابی رسول ابو سعد خدری سے منقول ہے:

لما نزل قولہ تعالیٰ: "واٰتِ ذا القربی حقہ" اعطی رسول اللہ فاطمة فدک۔

جب یہ آیت نازل ہوئی: "واٰتِ ذا القربی حقہ" تو رسول اللہنے فدک کا علاقہ فاطمہ(ص) کودے دیا۔ (۲)

بعض روایات سے یہ معلوم ہوتاہے کہ یہاں تک کہ حضرت سجاد علیہ السلام نے اسیری کے دوران شام میں اسی آیت سے شامیوں کے سامنے استدلال کرتے ہوئے فرمایا:

آیت "آتِ ذا القربی حقہ" سے مراد ہم ہیں کہ جن کے بارے میں خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ ان کا حق انہیں ادا کر ہم (جبکہ شامیو! تم نے ہمارے سب حقوق ضائع کردیئے ہیں) ۔ [۳]

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے مخالفت نہیں ہیں ۔

سب لوگوں کا فرض ہے کہ ذی القربیٰ کا حق ادا کریں ۔ رسول اللہ چونکہ اسلامی معاشرت کے رہبر ہیں لہٰذا ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس عظیم خدائی فریضہ پر عمل کریں ۔

در حقیقت اہل بیت رسول "ذی القربیٰ" کے واضح ترین مصداق ہیں اور رسول اللہ خود اس آیت کے روشن ترین مخاطب ہیں ۔ لہٰذا پیغمبر اکرم نے ذی القربیٰ کا حق کہ جو خمس، فدک یا اسی طرح دوسری چیزوں کی صورت میں تھا انہیں دے دیا کیونکہ زکوٰۃ کہ جو در حقیقت عمومی اموال میں شمار ہوتی ہے اس کا لینا ان کے لیے ممنوع تھا ۔

۲۔ اسراف کے بُرے اثرات :

اس میں شک نہیں کہ کرہ ارض میں موجود نعمتیں اس میں رہنے والوں کے لیے کافی ووافی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں بے ہودہ اور فضول استعمال نہ کیا جائے بلکہ صحیح اور معقول طریقے سے ہر قسم کی افراط وتفریط سے بچ کر ان سے استفادہ کیا جائے ورنہ یہ نعمات اس قدر غیر محدود بھی نہیں کہ ان کے استعمال کے مہلک نتائج نہ نکلیں ۔

افسوس کا مقام ہے کہ اکثر اوقات زمین کے ایک علاقے میں اسراف اور فضول خرچی کے باعث دوسرا علاقہ محرومیت کا شکار ہوجاتا ہے یا ایک زمانے کے لوگوں کا اسراف آیندہ نسلوں محرومیت کا باعث بن جاتا ہے ۔

جس زمانے میں آج کے دَور کی طرح لوگوں کے پاس آبادی کے اعداد وشمار موجود نہ تھے، اسلام نے خبردار کیا تھا کہ خدائی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اسراف اور فضول چرخی نہ کرو۔

قران حکیم نے بہت سی آیات میں مسرفین کی بڑی شدت سے مذمت کی ہے ۔

ایک جگہ فرمایا ہے:﴿وَلَاتُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾

اسراف نہ کرو کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔ (انعام ۔ ۱۴۱، اعراف ۔ ۳۱) ۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:﴿وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ﴾

اور یقینا مسرفین اصحاب دوزخ ہیں ۔ (مومن ۔ ۴۳) ۔

ایک اور مقام پر مسرفین کی پیروی سے روکتے ہوئے فرمایا ہے۔﴿وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ﴾

اور مسرفین کے حکم کی پیروی کی اطاعت نہ کرو۔ (شوراء۔۱۵۱)۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے:﴿مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ﴾

مفسرین پر تیرے پروردگار کی طرف سے نشان لگا دیئے گئے ہیں۔ (ذاریات۔۳۴)

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:﴿وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ﴾

شک نہیں کہ فرعون روئے زمین پر بڑا بن بیٹھا تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ مسرفین میں سے تھا۔ (یونس۔۸۳)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:ا﴿إِنَّ اللهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾

یقینا اللہ جھوٹے مسرف کہ ہدایت نہیں کرتا۔ (مومن۔۲۸)

اور آخر کار ان کا انجام ہلاکت ونابودی بتا یا گیا ہے:﴿وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِينَ﴾

اور ہم نے مفسرین کو ہلاکت کرڈالا۔ (انبیاء۔۲۸)

نیز جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ زیر بحث آیت میں مسرفین کو شیطان کا بھائی اور ہمنشین شمار کیا گیا ہے۔

"اسراف"اپنے وسیع معنی کہ لحاظ سے ہر قسم کے کام میں تجاوز کا مفہوم رکھتا ہے لیکن عام طور پر اخراجات میں حد سے تجاوز کے لیے بولا جاتا ہے۔

خود آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسراف کنجوسی اور تنگی کا متضاد ہے۔

قرآن کہتا ہے:﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا﴾

وہ لوگ کہ خرچ کرتے وقت اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔ (فرقان ۔۶۷)

۳۔"اسراف"اور"تبذیر"میں فرق:

اس سلسلہ میں مفسّرین کی طرف سے کوئی واضح بحث نظر سے نہیں گزری لیکن ان دونوں الفاظ کے بنیادی معانی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلے پر ہوں تو اسراف حد اعتدال سے نکل

جانے کے معنی میں ہے بغیر اس کے کہ ظاہراً کسی چیز کو ضائع کیا ہو۔ مثلاً یہ کہ ہم ایسا گراں قیمت لباس پہنتے ہیں کے جو ہماری ضرورت کے لباس سے سوگنا زیادہ قیمت کا ہے یا اپنی ایسی گراں قیمت غذا تیار کرتے ہیں کہ جتنی قیمت سے بہت سے لوگون کو عزت و آبرو سے کھانا کھلایا جاسکتا ہے ۔ایسے موقع پر ہم حد سے تجاوز کر گئے ہیں لیکن ظاہراً کوئی چیز ختم اور ضائع نہیں ہوئی۔

جبکہ "تنذیر" اس طرح سے خرچ کرنے کو کہتے ہیں کہ جو اتلاف اور ضیاع کی حد تک پہنچ جائے مثلاًدو مہمانوں کے لیے دس افراد کا کھانا پکالیں جیساکہ بعض نادان کے تے ہیں اور پھر اس پر فخر کے تے ہیں اور بچے ہوئے کھانے کو کوڑے کرکٹ میں پھینک کر ضائع کرتے ہیں ۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں :

"الا أن أعطاء المال فی غیر حقه تبذیر واسراف وهو یرفع صاحبه فی الدنیا ویضعه فی الآخرة ویکرمه فی الناس ویهینه عند الله"

خبر دار !مال کو اس کے مقام استحقاق کے علاوہ خرچ کرنا تبدیر و اسراف ہے ۔ ہوسکتا ہے یہ کام انسان کو دنیا میں بلند مرتبہ کردے لیکن آخرت میں وہ یقینا پست و حقیر ہوگا ۔ہو سکتا ہے عام لوگوں کی نظر میں اسے عزت و اکرام حاصل ہو جائے مگر بارگاہ الٰہی میں یہ کام انسان کی تنزلی اور سقوط کا سبب ہے ۔

زیر بحث آیات کی تشریح میں ہم نے پڑھا ہے کہ احکام اسلامی میں اسراف اور تبذیر کی اس قدر ممانعت کی گئی ہے کہ وضو کے لیے زیادہ پانی ڈالنے سے بھی منع کیا گیا ہے اگرچہ وضو کرنے والا لب دریا ہی کیوں نہ بیٹھا ہو ۔اسی طرح امام (ص) نے خرمے کی گٹھلیاں تک دُور پھینکنے سے منع کیا ہے ۔

آج کی دنیا میں بعض مواد کی کمی کے احساس نے اس امر کی طرف اتنی شدت سے توجہ دلائی ہے کہ اب ہر چیز سے استفاوہ کیا جارہا ہے ۔یہاں تک کہ کوڑا کرکٹ سے کھاد تیار کی جا رہی ہے اور پھوک سے اشیائے ضرورت تیار کی جارہی ہیں ۔استعمال شدہ گندے اور بچے ہوئے پانی سے زراعت کے لیے استفادہ کیا جارہا ہے کیونکہ آج لوگ محسوس کرتے ہیں کہ عالم طبیعی میں موجود مواد غیر محدود نہیں ہے کہ جس کے باعث اس امر سے آسانی سے صرف نظر کرلیا جائے بلکہ لوگ سمجھتے ہیں ہر چیز سے دوہرا استفادہ کرنا چاہیے ۔

۴۔کیا میانہ روی ایثار کے منافی ہے:

زیر بحث آیات کہ جو انفاق میں اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم کرنے والوں کی تعریف اور توصیف اور مدح وثنا کی گئی ہے یہاں تک کہ انتہائی مشکل کا حالات میں بھی اپنی ذات کو فراموش کر کے دوسرں کے لیے ایثار کرنے کی تشویق کی گئی ہے ۔لہٰذا یہ دونوں باتیں آپس میں کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہیں ۔

زیر بحث آیات کی شان نزول پر غور و خوص کرنے سے اور اسی طرح دیگر قرائن کو سامنے رکھنے سے مسئلہ واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم وہاں ہے جہاں زیادہ بخشش انسان کی اپنی بے سروسامانی کا سبب بن جائے اور اصطلاح کے مطابق وہ "ملوم و محسور" ہو جائے ۔یا ایثار اس کی اولاد کے لیے ناراحتی، پریشانی دباؤ اور تنگی کا باعث ہو جائے اور اس کے اپنے گھر کا نظام خطرے میں پر جائے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یقینا ایسے میں ایثار بہترین راہ ہے ۔

اس سے قطع نظر اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم عمومی ہے جبکہ ایثار ایک خواص حکم جو معین مواقع سے مربوط ہے لہٰذا یہ دونوں حکم ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں ۔

۱۔ فدک خیبر کے پاس اور مدینہ سے تقریباً ۱۴۰ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک آباد اور زرخیز زمین ہے، خیبر کے بعد حجاز کے یہودیوں کا یہ واحد سہارا شمار ہوتی تھی۔ (کتاب "مراصد الاطلاع" کے مادہ "مادہ فدک" کی طرف رجوع کریں)۔

۲۔ بزاز ابو یعلی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے یہ حدیث ابو سعید سے نقل کی ہے (کتاب میزان الاعتدال، ج۲، ص۲۸۸ اور کنز العمال، ج۲، ص۱۵۸ کی طرف رجوع کریں) مجمع البیان میں اور اسی طرح درمنثور میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں شیعہ اور سنن طرق کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے ۔

۳۔ نور الثقلین، ج۳، ص۲۵۵۔

آیات ۳۵،۳۴،۳۳،۳۲،۳۱

۳۱﴿وَلَاتَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا﴾

۳۲﴿وَلَاتَقْرَبُوا الزِّنَى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾

۳۳﴿وَلَاتَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِى حَرَّمَ اللهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَايُسْرِفْ فِى الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا﴾

۳۴﴿وَلَاتَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلاَّ بِالَّتِى هِىَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾

۳۵﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾

ترجمہ

۳۱۔ اور اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو۔ہم انہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں انہیں قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

۳۲۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

۳۳۔ اور جس شخص کا خون خدا نے حرام قرار دیا ہے اسے سوائے حق کے قتل نہ کرو اور جو شخص مظلوم مارا گیا ہے اس کے ولی کو ہم نے (حق قصاص) پر تسلط دیا ہے لیکن وہ قتل میں اسراف نہ کرے کیونکہ وہ مدد دیا گیا ہے۔

۳۴۔اور سوائے احسن طریقے کے مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ حدّ بلوغ کو پہنچ جائے اور اپنے عہد کو ایفا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

۳۵۔اور جب تم ناپ تول کرو تو پیمانہ کا حق ادا کرو اور ترازو سے وزن صحیح کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔

چھ اہم احکام

گزشتہ آیات میں احکام اسلامی کے کچھ حصے آئے ہیں۔ ان کے بعد زیر نظر آیات میں کچھ مزید احکام پیش کیے گئے ہیں۔چھ اہم احکام پانچ آیات میں بہت پر معنی اور دلنشین پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) پہلے زمانہ جاہلیت کے ایک بہت قبیح اور برے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ انتہائی دردناک گناہوں میں سے تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو﴿وَلَاتَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ﴾۔ان کی

روزی تمہارے ذمہ نہیں ہے بلکہ انہیں اور تمہیں ہم رزق دیتے ہیں ﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ﴾۔ کیونکہ ان کا قتل ایک بہت بڑا گناہ تھا اور ہے ﴿إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا﴾۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کی اقتصادی حالت اتنی سخت اور پریشان کن تھی کہ وہ اپنی مالی حالت پتلی ہونے کی وجہ سے اپنی عزیز اولاد تک کو قتل کردیتے تھے۔

مفسرین میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا زمانہ جاہلیت کے عرب فقر کے خوف سے صرف اپنی بیٹیوں کو مٹی میں دبا دیتے تھے یا بیٹیوں کو بھی زندہ در گور کردیتے تھے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ سب گفتگو بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ وہ لوگ ایسا دو وجوہ کی بناء پر کرتے تھے۔ ایک تو اس خیال کی بناء پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جنگ میں دشمنوں کی قید میں چلی جائیں اور اس طرح ان کی عزت و ناموس دوسروں کے ہاتھ آجائے۔

دوسرا فقر و فاقہ کی وجہ سے اور اسباب زندگی مہیا کرنے کی طاقت نہ ہونے کے سبب وہ لڑکیوں کو قتل کردیتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں لڑکی مالی پیداوار کا ذریعہ نہ تھی بلکہ اکثر اوقات اخراجات کا سبب شمار ہوتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابتداء میں بیٹے بھی اخراجات ہی کا باعث تھے لیکن زمانہ جاہلیت کے عرب ہمیشہ بیٹیوں کو اہم سرمائے کے طور پر دیکھتے تھے اور انہیں گنوانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ وہ دو طرح سے اولاد کو قتل کرتے تھے۔ ایک قتل وہ ناموس کی حفاظت کے غلط نام پر لڑکیوں کا کرتے تھے اور دوسرا فقر و فاقہ کے خوف سے بلا تخصیص بیٹے اور بیٹی کا۔

آیت کی ظاہری تعبیر کہ جو جمع مذکر (قتلھم اور نرزقھم) کی صورت میں آئی ہے، اس نظریے کی دلیل بن سکتی ہے کیونکہ عربی ادب کے لحاظ سے جمع مذکر کا اطلاق بیٹیوں پر مجموعی طور پر درست ہے لیکن خصوصیت سے اس کا بیٹیوں کے لیے ہونا بعید معلوم ہوتا ہے۔

البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ بیٹے پیداواری صلاحیت رکھتے تھے اور سرمایہ شمار ہوتے تھے، یہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ اس صورت میں کہ جب اس تھوڑی مدت کے لیے وہ اجراجات برداشت کرسکتے۔ حالانکہ بعض اوقات تو وہ اس قدر تنگ دستی میں ہوتے کہ اس تھوڑی سی مدت کے لیے بھی اسبابِ زندگی مہیا کرنے کے قابل نہ ہوتے۔

لہٰذا دوسری تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال یہ بات ایک وہم و گمان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ روزی دینے والے ماں باپ ہی ہیں ۔ خدا تعالیٰ اعلان کررہا ہے کہ اس شیطانی خیال کو دماغ سے نکال دو زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کے لئے اٹھ کھڑے ہو تو خدا بھی مدد کرے گا اور ان کی زندگی کا نظام چلادے گا ۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ ہم اس قبیح اور شرمناک جرم سے وحشت کرتے ہیں حالانکہ یہی جرم ہمارے زمانے میں ایک اور شکل میں موجود ہے ۔ یہاں تک کہ یہ کام بہت زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی انجام پاتا ہے اور وہ ہے اسقاطِ حمل۔ یہ کام بہت زیادہ بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام اور اقتصادی حالات کے نام پر کیا جارہا ہے ۔

(مزید توضیح کے لیے تفسیر نونہ جلد ۶ سورہ انعام کی آیہ ۱۵۱ کی طرف رجوع کریں)

”خشیۃ املاق“ بھی اس شیطانی وہم کی نفی کے لیے لطیف اشارہ ہے کہ یہ صرف ایک خوف ہے جو تمہیں اس بہت بڑے جرم پر ابھارتا ہے ورنہ اس میں حقیقت نہیں ہے ۔“

ضمناً توجہ رہے کہ ”کان خطاً کبیراً“ کہ جو فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے اس امر کے لیے اشارہ اور تاکید ہے کہ اولاد کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے کہ جو قدیم زمانے سے لوگوں میں موجود ہے اور اس کی قباحت اور برائی فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے لہٰذا یہ قباحت کسی زمانے سے مخصوص نہیں ہے ۔

(۲) ایک اور عظیم گناہ کہ جس کی طرف اگلی آیت اشارہ کرتی ہے وہ زنا اور منافی عفت عمل ہے ۔ قرآن کہتا ہے: زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ بہت بُرا اور قبیح عمل ہے اور بہت بری روشن ہے ﴿وَلَاتَقْرَبُوا الزِّنٰى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾ ۔

اس مختصر سے جملے میں تین نکات کی طرف اشارہ ہوا ہے:

الف ۔ یہ نہیں فرمایا کہ زنانہ کرو۔ بلکہ فرمایا کہ اس شرمناک کام کے قریب نہ جاؤ۔ یہ تعبیر اپنی گہرائی کے اعتبار سے اس حکم کے لیے تاکید ہے نیز یہ اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ اکثر اوقات اس گناہ کے کچھ تمہیدی اعمال بھی ہوتے ہیں جو تدریجاً انسان کو اس کے قریب کردیتے ہیں ۔ ہوا و ہوس کی نظر سے عورتوں کو دیکھنا بھی اس کا ایک مقدمہ ہے ۔ بے پردگی اس کا دوسرا مقدمہ ہے ۔ بری باتیں سکھانے والی کتابیں، گندی فلمیں، گھٹیا جرائد اور برائی کے مختلف مراکز بھی اس کام کا مقدمہ فراہم کرتے ہیں ۔

اسی طرح نامحرم عورتوں کے ساتھ خلوت بھی اس کا ایک عامل ہے (یعنی ایک نامحرم مرد اور عورت کسی خالی مکان یا مقام پر ہوں تو وہ بھی اس کا عامل بن سکتا ہے)۔

اسی طرح جوان لڑکے اور لڑکی کی شادی نہ کرنا اور دونوں پر بلا وجہ سختیاں عائد کرنا بھی اس کا سبب بن جاتا ہے۔

یہ سب "زنا کے قریب جانے کے" عامل ہیں۔ مذکورہ آیت اپنے مختصر جملے میں ان سب سے روکتی ہے۔ اسلامی روایات میں ان مقدمات میں سے ہر ایک کی الگ الگ ممانعت کی گئی ہے۔

ب۔ "انہ کان فاحشۃ" میں تین تاکیدیں موجود ہیں:

ایک "انّ" دوسری فعل ماضی اور تیسری "فاحشۃ"۔

ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گناہ کتنا بڑا ہے۔

ج۔ "ساء سبیلا" (یعنی زنا بہت بری روش ہے)۔ یہ جملہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ عمل معاشرے میں دیگر بُرائیوں کو بھی کھینچ لاتا ہے۔

زنا کا فلسفہ حرمت

(الف) اس سے خاندانی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ ماں باپ اور اولاد کے درمیان رابطہ ختم ہوجاتا ہے جبکہ یہ وہ رابطہ ہے جو نہ صرف معاشرے کی شناخت کا سبب ہے بلکہ خود اولاد کی نشود و نما کا موجب بھی ہے۔ یہی رابطہ ساری عمر محبت کے ستونوں کو قائم رکھتا ہے اور انہیں دوام دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ جس معاشرے میں غیر شرعی اور بے باپ کی اولاد زیادہ ہو اس کے اجتماعی روابط سخت تزلزل کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان روابط کی بنیاد خاندانی روابط ہیں۔

اس مسئلے کی اہمیت سمجھنے کے لیے لحظہ بھر اس امر پر غور کرنا کافی ہے کہ اگر سارے انسانی معاشرے میں زنا جائز اور مباح ہوجائے اور شادی بیاہ کا قانون ختم کردیا جائے تو ان حالات میں غیر مشخص اور بے ٹھکانہ اولاد پیدا ہوگی۔ اس اولاد کو کسی کی مدد اور سرپرستی حاصل نہ ہوگی۔ اسے نہ پیدائش کے وقت کوئی پوچھے گا نہ بڑا ہو کر۔

اس سے قطع نظر برائیوں، سختیوں اور مشکلوں میں محبت کا اثر تسلیم شدہ ہے جبکہ ایسی اولاد اس محبت سے محروم ہوجائے گی اور انسانی معاشرہ پوری طرح تمام پہلوؤں سے حیوانی درندگی کی شکل اختیار کرلے گا۔

(ب) یہ شرمناک اور قبیح عمل ہوس باز لوگوں کے درمیان طرح طرح کے جھگڑوں اور کشمکشوں کا باعث بنے گا۔ وہ واقعات کہ جو بعض افراد نے بدنام محلوں اور غلط مراکز کی داخلی کیفیت کے بارے میں لکھے ہیں ان سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جنسی بے راہ رویاں بدترین جرائم کو جنم دیتی ہیں۔

(ج) یہ بات علم اور تجربے نے ثابت کردی ہے کہ زنا طرح طرح کی بیماریاں پھیلنے کا سبب بنا ہے۔ اس کے آثارِ بد اور برے نتائج کی روک تھام کے لیے آج کے دور میں بہت سے ادارے قائم ہیں اور بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں مگر اعداد و شمار نشاندہی کرتے ہیں کہ کس قدر افراد اس راستے میں اپنی صحت و سلامتی گنوا بیٹھے ہیں۔

(د) اکثر اوقات یہ عمل اسقاطِ حمل، قتل اولاد اور انقطاع نسل کا سبب بنتا ہے کیونکہ ایسی عورتوں ایسی اولاد کی نگہداری کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتیں اور اصولاً اولاد ان کے لیے ایسا منحوس عمل جاری رکھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے لہذا وہ ہمیشہ اسے پہلے سے ختم کردینے کی کوشش کرتی ہیں۔

یہ مفروضہ بالکل موہومی ہے ایسی اولاد حکومت کے زیر کنٹرول اداروں میں رکھی جاسکتی ہے۔ اس مفروضے کی ناکامی عملی طور پر واضح ہوچکی ہے اور ثابت ہوچکا ہے کہ اس صورت میں بن باپ کی اولاد کی پرورش کس قدر مشکلات کا باعث ہے اور نتیجتاً بہت ہی نامرغوب اور غیر پسندیدہ ہے۔ ایسی اولاد سنگدل، مجرم، بے حیثیت اور ہر چیز سے عاری ہوتی ہے۔

(ہ) یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ شادی بیاہ کا مقصد صرف جنسی تقاضے پورے کرنا نہیں بلکہ تشکیل حیات میں اشتراک، روحانی محبت، فکری سکون، اولاد کی تربیت اور تمام حالاتِ زندگی میں ہمکاری شادی کے نتائج میں سے ہیں اور ایسا بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ عورت اور مرد باہم مخصوص ہوں اور عورتیں دوسروں پر حرام ہوں۔

امام علی بن ابی طالب علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا:

فی الزناست خصال:ثلث فی الدنیا و ثلث فی الأخرة، فأما اللّواتی فی الدنیا فیذھب بنورالوجه، و یقطع الرزق، ویسرع الفناء و أما اللّواتی فی الأخرة فغضب الرب و سوءِ الحساب و الدخول فی النار، أو الخلود فی النار۔

زنا کے چھ بُرے اثرات ہیں: ان میں سے تین کا تعلق دنیا سے ہے اور تین کا تعلق آخرت سے ہے۔ دُنیاوی بُرے اثرات یہ ہیں کہ یہ عمل انسان کی نورانیت گنوادیتا ہے، روزی منقطع کردیتا ہے اور جلد فنا سے ہمکنار کردیتا ہے۔

اُخروی آثار یہ ہیں کہ یہ عمل پروردگار کے غضب، حساب کتاب میں سختی اور آتشِ جہنم میں دخول یا دوام کا سبب بنتا ہے ۔ [۱]

(۳) اگلی آیت میں ایک اور حکم ہے ۔ یہ حکم انسانوں کے خون کے احترام کے بارے میں ہے اور قتل نفس کی انتہائی حرمت کا ترجمان ہے ۔ قرآن کہتا ہے: جس شخص کا خون خدا نے حرام قرار دیا ہے اسے سوائے حق کے قتل نہ کرو ﴿وَلَاتَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ﴾۔

انسان کے خون کا احترام اور قتل نفس کی حرمت ایسے مسائل ہیں جن میں تمام آسمانی شریعتیں، دین اور انسانی قوانین متفق ہیں اور اس قتل کو ایک بہت بڑا جرم اور گناہ شمار کرتے ہیں لیکن اسلام نے اس مسئلے کو بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے یہاں تک کہ ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے ۔ قرآن کہتا ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِی الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾

جو کسی کو نہ جان کے بدلے اور نہ فساد فی الرض کی سزا میں قتل کردے تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کرڈالا ۔ (مائدہ ۔ ۳۲)

یہاں تک کہ قرآن کی بعض آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دائمی عذابِ جہنم کہ جو کفار کے لیے مخصوص ہے قاتل کے لیے بھی بیان ہوا ہے اور ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہو کہ وہ افراد جن کے ہاتھ بے گناہ افراد کے خون سے رنگین ہوتے ہیں وہ دنیا سے ایمان کے ساتھ نہیں جائیں گے بہر حال قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا﴾

جس کسی نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کردیا تو اس کی جزاء جہنم ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا ۔ (نساء / ۹۳)

یہاں تک کہ جو افراد لوگوں کے سامنے ہتھیار کھینچتے ہیں ان کے لیے اسلام میں محارب کی حیثیت سے سنگین سزا مقرر ہوئی ہے جس کی تفصیل فقہی کتب میں آئی ہے اس سلسلے میں ہم سورہ مائدہ آیہ ۳۳ کے ذیل میں اشارہ کر آئے ہیں ۔

نہ صرف قتل کرنا بلکہ کسی شخص کو کم سے کم اور چھوٹا آزار پہنچانے پر بھی اسلام میں سزا موجود ہے ۔

یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ خون، جان اور انسان کے مقام کا یہ سب احترام جو اسلام میں ہے کسی اور دین و آئین میں موجود نہیں ہے ۔

لیکن بالکل اسی وجہ سے کچھ ایسے مواقع آتے ہیں کہ خون کا احترام اٹھ جاتا ہے اور ان افراد کے لیے ہے جو قتل یا اس جیسے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ اسی لیے زیر بحث آیت میں پہلے حرمت قتل نفس کا بنیادی اور عمومی قانون بیان کیا گیا اور اس کے فوراً بعد "الّا بالحق" کہہ کر ایسے افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے:

لایحل امرء مسلم یشھد أن لا الٰہ الّا اللہ وأنّ محمداً رسول اللہ الّا بأحدی الثلاث: النفس بالنفس، والزانی المحصن، والتارک لدینہ المفارق للجماعۃ-

کسی مسلمان کا خون کہ جو "لا الہ الا اللہ" اور "محمد رسول اللہ" کی گواہی دیتا ہو حلال نہیں ہے مگر تین مواقع پر۔ ایک یہ کہ وہ قاتل ہو، زانی محصن ہو اور وہ جو اپنا دین چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے ۔ (۲)

قاتل کے بارے میں حکم تو واضح ہے ۔ اس کے قصاص میں معاشرے کی حیات اور انسانوں کی حفظِ جان کی ضمانت اور اگر اولیاءِ مقتول کو حقِ قصاص نہ دیا جائے تو قاتلوں کو شہ ملے گی اور معاشرے کا امن و امان تباہ ہوجائے گا ۔

باقی رہا زانی محصن تو اس کا قتل ایک ایسے انتہایی قبیح گناہ کے بدلے میں ہے جو قتل کے برابر ہے ۔ نیز مرتد کا قتل اسلامی معاشرے میں حرج مرج کو روکتا ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ ایک سیاسی حکم ہے، تا کہ نظام اجتماعی کی حفاظت کی جاسکے کیونکہ ارتداد نہ صرف اجتماعی امن و امان کے لیے خطرہ ہے بلکہ خود نظام اسلام کے لیے بھی خطرہ ہے ۔

اصولی طور پر اسلام کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ یہ دین قبول کرے ۔ دوسرے ادیان سے اسلام منطقی بنیاد پر معاملہ کرتا ہے اور آزاد بحث و مباحثہ کا قائل ہے لیکن اگر کسی نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا او ر اسلامی معاشرے کا جز بن گیا اور اس طرح مسلمانوں کے اسرار سے آگاہ ہوگیا ۔ اب اگر وہ دین سے پلٹ جانا چاہے اور عملی طور پر نظام اسلام کی بنیاد کمزور کرنا چاہے اور اسلامی معاشرے کے ستون گرانا چاہے تو یقیناً یہ عمل ناقابل برداشت ہے اور ان شرائط کے ساتھ اس کی سزا قتل ہے ۔ (۳)

البتہ اسلام میں انسانوں کے خون کا احترام مسلمانوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ غیر مسلمان جو مسلمانوں سے بر سرِ جنگ نہیں ہیں اور ان سے دامن و سلامتی کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کی جان و مال ائرنا موس بھی محفوظ ہے اور ان پر تجاوز کرنا حرام اور ممنوع ہے ۔ اس کے بعد قرآن اولیاء مقتول کے حق قصاص کے بارے میں کہتا ہے: جو شخص

مظلوم مارا جائے اس کے ولی کو ہم نے (قاتل سے قصاص لینے کا) تسلط دیا ہے ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا﴾۔

لیکن اسے بھی نہیں چاہیے کہ ان حالات میں وہ اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور قتل میں اسراف کرے کیونکہ وہ مدد دیا گیا ہے ﴿فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا﴾۔

جی ہاں! اولیاءِ مقتول جب تک حد اسلام کے اندر رہتے ہیں اور اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے وہ نصرت الٰہی کے زیر سایہ ہیں یہ جملہ ان اعمال کی طرف اشارہ ہے زمانہ جاہلیت میں تھے اور بعض اوقات آج کل بھی ہوتے ہیں۔ کبھی ایک شخص کے قتل کے علاوہ اور بہت سے بے گناہ افراد قتل کردیئے جاتے ہیں۔ جیسے زمانہ جاہلیت کی رسوم میں تھا کہ جب کسی قبیلے کا کوئی معروف آدمی قتل ہوجاتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل کے قتل پر قناعت نہ کرتا بلکہ ضروری سمجھتا کہ قاتل کے قبیلے کا سردار معروف شخص قتل کرے چاہے اس قتل میں اس کا کوئی حصّہ نہ ہو۔ (۴)

ہمارے زمانے میں بھی بعض اوقات ایسے جرائم ہوتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ خصوصاً غاصب اسرائیل کا یہی کردار ہے۔ جب کوئی فلسطینی مجاہدان میں سے کسی کو قتل کردے تو وہ فوراً فلسطینی بچوں اور عورتوں پر بم برسانے لگتے ہیں اور بعض اوقات ایک شخص کے بدلے بیسیوں بے گناہ افراد کو خاک و خون میں تڑپا دیتے ہیں۔

عراق کی بعث پارٹی کی طرف سے ہمارے اسلامی ملک پر مسلط کردہ جنگ میں بھی یہی صورتِ حال دیکھتے ہیں۔ آئندہ تاریخ ان کے بارے میں فیصلہ کرے گی ہم یہ معاملہ اسی کے سپرد کرتے ہیں۔

اسلام میں عدالت کی اس قدر اہمیت ہے کہ اسے قاتل تک کے لیے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنی وصیتوں میں فرماتے ہیں:

يا بنى عبد المطلب لا الفينكم تخوضون دماء المسلمين خوضاً تقولون قتل اميرالمومنين، الّا لا تقتلن بى الّا قاتلى، انظروا اذا انامت من ضربته هذه فاضربوه، ولا تمثلوا بالرجل۔

اے اولادِ عبد المطلب! مبادا میری شہادت کے بعد مسلمانوں کا خون بہانے لگو اور کہو کہ امیر المومنین مارے گئے ہیں اور اس بہانے سے لوگوں کا خون بہانے لگو۔ آگاہ رہو کہ صرف میرا قاتل (عبد الرحمن بن ملجم مرادی) قتل ہوگا۔ پوری

طرح غور کرنا کہ جب میں اس ضرب سے شہید ہوجاؤں کہ جو مجھ پر لگائی گئی ہے تو اسے صرف ایک ضرب کاری لگانا اور قتل کے بعد اس کا مثلہ نہ کرنا (ناک کان وغیرہ نہ کاٹنا)۔ [۵]

(۴) اگلی آیت میں اس سلسلہ احکام کا چوتھا حکم ہے۔ پہلے یتیموں کے مال کی حفاظت کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس میں وہی لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے جو منافی عفت عمل کے بارے میں گزشتہ آیات میں اختیار کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: یتیموں کے مال کے قریب نہ جاؤ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ﴾

نہ صرف یہ کہ یتیموں کا مال نہ کھاؤ بلکہ اس کے حریم و حدود کو بھی محترم سمجھو۔ لیکن ممکن تھا کہ ناآگاہ لوگ اس حکم کو منفی حوالے سے دیکھتے اور یتیموں کا مال بے سرپرست چھوڑنے کے لیے اسے سند بنالیتے اور یوں یتیموں کا مال حوادث کے رحم و کرم پر رہ جاتا لہٰذا فوراً بلافاصلہ استثناء فرمایا گیا ہے: مگر نہایت اچھے طریقے سے ﴿إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾۔

اس جامع اور واضح تعبیر کے مطابق یتیموں کے اموال میں ہر ایسا تصرف جائز ہے جو ان کی حفاظت، اصلاح اور اضافے کی نیت سے ہو اور جس میں قبل ازیں ان کے ضروری پہلوؤں کا اتلاف نہ ہونے کی منصوبہ بندی کرلی گئی ہو بلکہ ایسا تصرف ان یتیموں کی ایک خدمت ہے جو اپنے مفادات کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ البتہ یہ کیفیت یتیم کے فکری و اقتصادی رشد تک پہنچنے کے وقت تک ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ زیرِ بحث آیت جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس زمانے تک کہ ان میں یہ طاقت پیدا ہوجائے ﴿حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ﴾۔

"اشد" مادہ "شدّ" (بروزن "جَد") سے محکم گرہ کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور اب یہ لفظ ہر قسم کے جسمانی و روحانی استحکام کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں "اشد" سے مراد حدّ بلوغ کو پہنچنا ہے لیکن جسمانی و بلوغت کافی نہیں بلکہ فکری و اقتصادی بلوغت ہونا چاہیے۔ اس طرح سے کہ یتیم اپنے اموال کی حفاظت کرسکے یہ تعبیر اسی لیے منتخب کی گئی ہے کہ یقینی طور پر آزما کر دیکھ لیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر معاشرے میں مختلف حوادث کے باعث یتیم موجود ہوتے ہیں۔ انسانی اقدار اور دیگر حوالوں سے ضروری ہے کہ یہ یتیم تمام پہلوؤں سے معاشرے کے خیر خواہ افراد کی سرپرستی میں ہوں۔ اسی لیے اسلام نے اس مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کا کچھ حصہ ہم سورہ نساء کی آیہ ۲ کے ذیل میں ذکر کر آئے ہیں (تفسیر نمونہ جلد ۳ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

جس چیز کا ہمیں یہاں اضافہ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ بعض روایات میں یتیم وسیع تر معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان افراد کو بھی یتیم کہا گیا ہے جو اپنے امام اور پیشوا سے جدا ہو چکے ہیں اور ایک مادی حکم سے معنوی استفادہ کیا گیا ہے۔

(۵) اس کے بعد ایفائے عہد کا مسئلہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اپنا عہد وفا کرو کیونکہ ایفائے عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾۔

بہت سے معاشرتی روابط، اقتصادی نظام اور سیاسی مسائل عہد وپیمان کے گرد گھومتے ہیں۔ اگر عہد وپیمان متزلزل ہوجائے اور اعتماد اٹھ جائے تو معاشرے کا نظام تیزی سے درہم برہم ہوجائے اور اس پر وحشتناک حرج ومرج مسلط ہوجائے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن آیات میں ایفائے عہد پر بہت زور دیا گیا ہے۔

عہد وپیمان کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں افراد کے درمیان جو اقتصادی اور کاروباری پیمان ہوتے ہیں وہ بھی شامل ہیں اور شادی بیاہ وغیرہ کے پیمان بھی شامل ہیں۔ ان میں وہ معاہدے بھی شامل ہیں جو اقوام وملل اور حکومتوں کے درمیان ہوتے اور ان سے بڑھ کر خدائی پیمان اور آسمانی رہبروں کے اپنی امتوں سے کیے گئے پیمان یا امتوں کی طرف سے ان سے باندھے گئے پیمان بھی اس میں شامل ہیں۔ [۶]

(٦)آخری زیرِ بحث آیت میں آخری حکم ناپ تول میں عدالت کے بارے میں ہے۔ اس کے ذریعے حقوق الناس کی حفاظت اور کم فروشی کا سدِّباب مقصود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب کسی پیمانہ سے کوئی چیز ناپو تو اس کا حق ادا کرو ﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ﴾۔ اور صحیح اور سیدھے ترازو سے وزن کرو ﴿وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ﴾۔ کیونکہ یہ کام تمہارے فائدے میں ہے اور اس کا انجام سب سے بہتر ہے ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾۔

۱۔ تفسیر مجمع البیان ج ۶ ص ۴۱۴-

۲۔ تفسیر فی ضلال، ج۵، ص ۳۲۳ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم-

۳۔ ارتداد اور اس کی سخت سزا کے بارے میں سورہ نحل کی آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۱ میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

۴۔ تفسیر روح المعانی از آلوسی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں -

۵۔ نہج البلاغہ، حصہ مکتوبات نمبر ۴۷-

۶۔ ایفائے عہد اور قسم پوری کرنے کی اہمیت کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سورہ نحل آیہ ۹۱ تا ۹۴ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں

چند اہم نکات

۱۔ کم فروشی کا نقصان:

پہلا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن مجید میں بارہا کم فروشی، وزن میں کمی اور دھوکا بازی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے۔ ایک مقام پر یہ مسئلہ وسیع عالمِ ہستی کے نظامِ خلقت کے ہم پلّہ رکھا گیا ہے:

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ، أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ﴾۔

خدا نے آسمان بلند کیا اور ہر چیز میں میزان اور حساب و کتاب رکھا تا کہ تم وزن اور حساب و کتاب میں سرکشی نہ کرو۔ (رحمٰن۔ ۷و۸)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ناپ تول پورا رکھنا کوئی کم اہم مسئلہ نہیں بلکہ اصل عدالت اور اس آفرینش کے نظم و ضبط کا حصّہ ہے جو پورے عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔

ایک اور مقام پر شدید اور دھمکی آمیز لہجے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ، الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ، وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ، أَلَا يَظُنُّ أُولَئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ، لِيَوْمٍ عَظِيمٍ﴾

وائے اور ہلاکت ہے کم فروشی کرنے والوں کے لیے کہ جو خریدتے وقت اپنا حق پورا پورا لیتے ہیں اور بیچتے وقت کم وزن میں کمی کرتے ہیں کیا وہ یہ گمان نہیں کرتے کہ قیامت کے عظیم دن عدل الٰہی کی بارگاہ میں مبعوث ہوں گے۔ (مطففین۔ ۱۔۵)

یہاں تک کہ قرآن مجید میں بعض انبیاء کے حالات میں ہے کہ ان کے شدید مبارزہ کا رُخ شرک کے بعد کم فروشی کی طرف تھا مگر ان کی ظالم قوم نے پرواہ نہ کی اور خدا کے شدید عذاب میں گرفتار ہو کر نابود ہو گئی۔

(تفسیر نمونہ جلد ۶ دیکھیے۔ سورہ اعراف کی آیہ ۸۵ کے ذیل میں، مدین میں حضرت شعیب (ص) کی تبلیغ کے ضمن میں تفصیلات ذکر کی گئی ہیں)۔

اصولی طور پر حق و عدالت، نظم و ضبط اور حساب و کتاب ہر چیز میں لا اور ہر جگہ بنیادی اور حیاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ روح ہے جو تمام عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔ لہٰذا اس بنیادی مسئلے سے کسی بھی قسم کا

انحراف خطرناک اور بد انجام ہوگا خصوصاً کم فروشی اعتماد و اطمینان کا سرمایہ ختم کردیتی ہے کہ جو مبادلات کا اہم رکن ہے ۔ یہ کام اقتصادی نظام کو درہم برہم کردیتا ہے ۔

بہت ہی افسوس کا مقام ہے کہ بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں اس اصول کو اپنا نے میں غیر مسلم بعض فرض شناسی مسلمانوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دنیا کی منڈیوں میں اسی وزن کے مطابق اجناس پہنچائیں جو ان پر لکھا ہوا ہے تاکہ دوسروں کا اعتماد حاصل کر سکیں ۔

جی ہاں ! وہ جانتے ہیں کہ انسان اہل دنیا بھی ہوتا اس راستہ یہی ہے کہ معاملہ میں خیانت نہ کرے ۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حقوق کے اعتبار سے کم فروش خریداروں کے مقروض ہیں ۔ لہٰذا ان کی توبہ یہ حقوق ادا کیے بغیر نہیں ہوسکتی جو انہوں نے غصب کیے ہیں ۔یہاں تک کہ اگر وہ ان حقوق کے مالکوں کو نہیں پہچانتے تب بھی انہیں چاہیئے کہ ان کے برابر ”ردّ مظالم“ کے طور پر اصلی مالکوں کی طرف سے سے فقرا اور مساکین کو دیں ۔

۲۔کم تولنے کے مفہوم کی وسعت:

بعض اوقات کم فروشی کا مفہوم وسعت اختیار کر جاتا ہے اور اس میں عمومیت آجاتی ہے ۔ اس طرح سے کہ ہر قسم کی کوتاہی اور فرائض کی انجام دہی میں کمی اس کے مفہوم میں شامل ہوجاتی ہے ۔ لہٰذا وہ کارگیر جو اپنے کام میں کچھ کمی چھوڑ دیتا ہے ، وہ استاد جو ٹھیک طرح سے درس نہیں دیتا، وہ مزدور جو بر وقت کام پر حاضر نہیں ہوتا اور دل جمعی سے کام نہیں کرتا ۔ اس حکم کے مخاطب ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کے حصہ دار ہیں ۔

البتہ زیرِ بحث آیت کے الفاظ براہِ راست اس عمومیت کے لیے نہیں ہیں بلکہ مفہوم کی یہ وسعت عقلی ہے لیکن سورہ رحمن میں جو تعبیر آئی ہے وہ اس عمومیت اور وسعت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ، أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ﴾

۳۔”قسطاس“ کا مفہوم:

قاف کے نیچے زیر اور پیش کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے (”بروزن ”مقیاس“ اور کبھی بر وزنِ ”قُرآن“) اس کا معنی ہے ترازو ۔بعض اسے رومی زبان کا لفظ سمجھتے ہیں اور بعض عربی کا ۔بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اصل میں یہ دو لفظوں کا مرکب ہے ”قسط“ بمعنی عدل انصاف اور ”طاس“ بمعنی ترازو کا پلڑا ۔بعض کہتے ہیں کہ ”قسطاس“ بڑے ترازو کو اور ”میزان“ چھوٹے ترازو کو کہتے ہیں ۔ (۱)

بہر حال ”قسطاس“ سے مراد متقسیم اور صحیح سالم ترازو ہے جو بے کم وکاست عادلانہ وزن کرے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام اس لفظ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

هو الذى له لسان

ترازو وہ میزان ہے جس کی زبان (دو پلڑوں کا توان بتانے والی سوئی) ہو۔ [۲]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو ترازو اس سوئی کے بغیر ہوتے ہیں وہ دو پلڑوں کی حرکات اور توازن کو پوری طرح واضح نہیں کرتے لیکن اگر ترازو میں یہ معیاری سوئی ہو تو پلڑوں کی تھوڑی سی حرکت بھی اس سے ظاہر ہو جائے گی اور عدالت پوری طرح ملحوظ رکھی جاسکے گی۔

۱۔ تفسیر المیزان، تفسیر فخر الدین رازی و تفسیر مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

آیات ۳۶،۳۷،۳۸،۳۹،۴۰

۳۶﴿وَلَاتَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُوْلَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾

۳۷﴿وَلَاتَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾

۳۸﴿كُلُّ ذَلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا﴾

۳۹﴿ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَاتَجْعَلْ مَعَ اللهِ إِلَهًا آخَرَ فَتُلْقَى فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَدْحُورًا﴾

۴۰﴿أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا﴾

ترجمہ

۳۶۔ اس کہ پیروی نہ کر جس کا تجھے علم نہ ہو کیونکہ کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا ۔

۳۷۔ زمین پر تکبّر سے نہ چل، تو زمین کو چیر نہیں سکتا اور تیرے قد کی لمبائی ہرگز پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتی ۔

۳۸۔ ان سب کے گناہ تیرے پروردگار کہ ہاں لائقِ نفرت قرار پائے ہیں ۔

۳۹۔ یہ احکام ان حکمتوں میں سے ہیں جو تجھے تیرے پروردگار نے وحی کے ذریعے دی ہیں اور اللہ کے ساتھ ہرگز کسی کو معبود قرار نہ دے کہ تو جہنم میں جا گرے گا اس حالت میں کہ درگاہ خدا سے ملامت شدہ اور راندہ ہو گا ۔

۴۰۔ کیا خدا نے بیٹے تم سے مخصوص کردیئے ہیں اور خود ملائکہ میں سے بیٹیاں لے لی ہیں ۔ تم بہت بڑی (اور انتہائی غلط) بات کہتے ہو ۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ہم نے اسلام کی کچھ انتہائی بنیادی تعلیمات پڑھی ہیں ۔ یہ مسئلہ توحید سے شروع ہوتا ہے کہ جس سے ان تمام تعلیمات کا خمیر اٹھتا ہے اور پھر وہ احکام ہیں کہ جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مربوط ہیں زیرِ نظر آیات میں ہم ان احکام کے آخری حصّے تک جاتے ہیں ۔یہاں چند مزید اہم احکام کی طرف اشارہ گیا ہے ۔

۱۔ صرف علم کی پیروی کرو:

پہلے تمام چیزوں میں تحقیق کو ضرورت قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کی پیروی نہ کرو ﴿وَلَاتَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهِ عِلْمٌ﴾ ۔ نہ اپنے ذاتی عمل میں علم کے بغیر عمل کر اور نہ دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت بغیر علم کے شہادت دے اور نہ ہی علم کے بغیر کوئی عقیدہ و نظریہ قائم کر۔

گویا غیر عالم کی پیروی سے ممانعت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے ۔ اس میں اعتقادی امور بھی شامل ہیں، شہادت، قضائت اور عمل بھی۔ یہ جو بعض مفسرین نے اسے کچھ امور محدود کردیا ہے اس کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے کیونکہ "تقف" "قفو" (بروزن "عفو") کے مادہ سے کسی چیز کے پیچھے لگنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ غیر علم کے پیچھے لگنا وسیع مفہوم رکھتا ہے ۔ اور اس میں تمام مذکورہ چیزیں شامل ہیں ۔

لہٰذا ہر چیز کی شناخت کا معیار علم و یقین ہے اور اس کے علاوہ ظن و گمان ہو، حدس و تخمین ہو یا شک و احتمال کچھ بھی قابل اعتماد نہیں ہے ۔ جو لوگ ان امور کی بنیاد پر اعتماد کرلیتے ہیں یا فیصلے کی مسند پر بیٹھ جاتے ہیں یا شہادت دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے ذاتی عمل میں ان کی بنیاد پر قدم اٹھاتے ہیں وہ اس صریح حکم اسلامی کے خلاف عمل کرتے ہیں ۔

دوسرے لفظوں میں نہ شہرت پانے والی چیزیں قضائت، شہادت اور عمل کی بنیاد بن سکتی ہیں قرائن ظنی اور غیر یقینی خبریں کہ جو غیر مؤثق ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہیں ۔

آیت کے آخر میں اس ممانعت کی دلیل اس طرح بیان کی گئی ہے:"کان، آنکھ اور دل سب کے سب مسئول ہیں" اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں اس کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُوْلٰئِکَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ ۔

یہ ذمہ داری اس بناء پر ہے کہ جو باتیں انسان علم و یقین کے بغیر کہتا ہے وہ یا اس نے غیر مؤثق افراد سے سنی ہوتی ہیں، یا وہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے جبکہ اس نے دیکھا نہیں ہوتا، یا وہ اپنے فکر و خیال کی بنیاد پر بے بنیاد فیصلے کرتا ہے کہ جو حقیقت پر منطبق نہیں ہوتے ۔ اسی بناء پر اس کی آنکھ، کان اور فکر و عقل سے سوال کیا جائے گا کہ کیا واقعاً تم ان امور کے بارے میں یقین رکھتے تھے کہ تم نے ان کے بارے میں گواہی دی یا فیصلہ کیا یا ان کے معتقد ہوئے اور ان کے مطابق عمل کیا ۔

اگر چہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان اعضاء وجوارح سے سوال کرنے سے مراد یہ اعضاء رکھنے والوں سے سوال کرنا ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن دیگر آیات (مثلاً فصلت ۔ ۲۱) میں تصریح کرتا ہے کہ روز قیامت انسانی

جسم کے اعضاءیہاں تک کہ بدن کی کھال بھی بات کرے گی اور یہ اعضاء حقائق بیان کریں گے، تو کوئی دلیل موجود نہیں کہ ہم آیت کے ظاہری مفہوم کو چھوڑدیں اور یہ نہ کہیں کہ خود ان اعضاء سے سوال ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ حواس انسانی میں سے صرف آنکھ اور کان کا ذکر کیوں کیا گیا ہے، تو اس کی دلیل اور وجہ واضح ہے کیونکہ انسان کی حسّی معلومات کا ذریعہ عام طور پر دو ہی ہیں اور باقی حواس ان کے تحت ہیں۔

نظم معاشرہ کے لیے ایک اہم درس

مذکورہ بالا آیت اجتماعی زندگی کے ایک انتہائی اہم اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے نظر انداز کردینے کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ معاشرہ حرج مرج کا شکار ہوجائے گا انسانی رابطہ ختم ہوجائیں گے اور احساسات کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔

اور اگر یہ قرآنی پروگرام تمام انسانی معاشروں میں پوری طرح سے جاری ہوجائے تو بہت سی بدنظمیاں، بے اعتدالیاں اور مشکلات ختم ہوجائیں کہ جن کا سرچشمہ جلد بازی کے فیصلے، بے بنیاد گمان، مشکوک اور جھوٹی خبریں ہوتی ہیں۔

اگر قرآن کا یہ حکم رائج نہ ہو تو معاشرہ پر حرج مرج اور فتنہ و فساد کی فضا چھا جائے گی اور کوئی شخص دوسرے کی بدگمانی سے نہیں بچ سکے گا، کسی کو کسی پر اطمینان نہیں ہوگا اور تمام افراد کی عزت و آبرو اور مقام ہمیشہ خطرے میں رہے گا۔

بہت سی دیگر قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً:

(۱) وہ آیات کہ جو ظن و گمان کی پیروی کرنے کی وجہ سے بے ایمان افراد کی شدید مذمت کرتی ہیں۔ مثلاً:

﴿وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلاَّ ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَايُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾۔

ان میں اکثر اپنے فیصلوں میں صرف ظن وگمان کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ظن وگمان انسان کو کسی طرح بھی حق و حقیقت تک نہیں پہنچا سکتے۔ (یونس۔۳۶)

(۲) ایک اور مقام پر پیروی ظن کو ہوائے نفس کی پیروی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلاَّ الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُس﴾۔

وہ صرف گمان اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ (نجم۔۲۳)

(۳) ایک حدیث میں امام صادق سے مروی ہے:ان من حقیقة الایمان ان لا یجوز منطقک علمک

ایمان کی حقیقت میں سے یہ ہے کہ تیری گفتگو تیرے علم سے زیادہ نہ ہو اور جتنا تو جانتا ہے تو اس سے زیادہ بات نہ کرے ۔ (۱)

(۴) ایک اور حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے مروی ہے، آپ(ص) اپنے آباؤ اجداد سے نقل کرتے ہیں :

لیس لک ان تتکلم بما شئت، لان اللہ عزوجل یقول﴿ولا تقف ما لیس لک بہ علم﴾۔

تو جو چاہے نہیں کہہ سکتا کیونکہ خدا کہتا ہے: جس کا تجھے علم نہیں اس کی پیروی نہ کر۔ (۲)

(۵) ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے، آپ فرماتے ہیں :

ایّاکم والظن فان الظن اکذب الکذب

گمان سے پرہیز کرو کیونکہ گمان بدترین جھوٹ ہے ۔ (۳)

(٦) ایک شخص امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا ۔ اس نے عرض کی:

میرے کچھ ہمسائے ہیں ۔ ان کے پاس گانے بجانے والی کنیزیں ہیں ۔ وہ گاتی بجاتی ہیں ۔ بعض اوقات میں بیت الخلاء میں جاتا ہوں تو زیادہ دیر بیٹھا رہتا ہوں تاکہ ان کے گیت سن سکوں حالانکہ میں اس مقصد کے لیے نہیں جاتا ۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

کیا تو نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا:﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُوْلٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾

(یقینا کان، آنکھ اور دل سب سے سوال ہوگا)

اس نے عرض کیا: مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے یہ آیت میں نے ہرگز کبھی کسی عرب یا عجم سے نہیں سنی میں ابھی سے یہ کام چھوڑتا ہوں اور بارگاہ الٰہی میں توبہ کرتا ہوں ۔ (۴)

بعض مصادر حدیث میں اس روایت کے ذیل میں ہے کہ امام (ص) نے اسے حکم دیا:

جاؤ اور غسل توبہ کرو اور جس قدر ہو سکے نماز پڑھو کیونکہ تم نے بہت بُرا کام کیا ۔ اگر تو اس حالت میں مرجاتا تو تجھے عظیم جواب وہی کا سامنا کرنا پڑتا ۔

یہ آیات اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ(ص) سے منقول احادیث سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام کس طرح انسان کی آنکھ اور کان کو مسئول قرار دیتا ہے ۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ انسان جب تک نہ دیکھے نہ کہے، جب تک نہ سنے فیصلہ نہ کرے اور تحقیق، علم اور یقین کے بغیر کسی چیز کا اعتقاد نہ رکھے، نہ عمل کرے اور نہ قضاوت کرے ۔

گمان، تخمینے، اندازے اور سنی سنائی باتوں کی پیروی کرنا اور علم ویقین کے بغیر کسی چیز کے پیچھے لگنا فرد اور معاشرے کے لیے بہت بڑے خطرات پیدا کرتی ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کے بہت زیادہ نقصانات ہیں ۔ مثلاً:

(۱) غیر علم پر بھروسہ کرنا لوگوں کے حقوق کی پامالی اور غیر مستحق افراد کو کسی کا حق دینے کا سرچشمہ ہے ۔

(۲) غیر علم کی پیروی آبرو مند افراد کی عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال دیتی ہے اور خدمت گزاروں کو بددِل کردیتی ہے ۔

(۳) غیر علم پر اعتماد پر اپیگنڈا، افواہوں اور جعل سازیوں کا بازار گرم کردیتا ہے ۔

(۴) غیر علم کی پیروی انسان میں تحقیق و جستجو کا جذبہ ختم کردیتی ہے اور اسے ایک جلد باور کرنے والا اور احمق شخص بنادیتی ہے ۔

(۵) غیر علم کی پیروی گھر، بازار، کاروبار غرض ہر جگہ پر سے گرم جوشی اور دوستی کے روابط ختم کردیتی ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں بدگمان بنادیتی ہے ۔

(٦) غیر علم کی پیروی ہمارے استقلالِ فکری کو ختم کردیتی ہے اور ہماری روح کو ہر قسم کا زہریلا پراپیگنڈا قبول کرنے پر آمادہ کردیتی ہے ۔

(۷) غیر علم کی پیروی ہر شخص اور ہر چیز کے بارے میں جلد بازی سے فیصلہ کرنے کا سرچشمہ ہے اور یہ خود طرح طرح کی ناکامیوں اور پشیمانیوں کا سبب ہے ۔

گمان کی طرف میلان کا سدِّ باب

اب جو سوال باقی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس بُری اور منحوس عادت اور اس کے دردناک انجام سے کس طرح اپنے آپ کو اور معاشرے کو نجات دلاسکتے ہیں، اس سوال کے جواب کے لئے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے البتہ ہم یہاں مختصر اور چچے تلے نکات کی صورت میں ایک دستور العمل پیش کرتے ہیں ۔

(الف) اس عمل کے دردناک نتائج اور انجام سے لوگوں کو پیہم آگاہ کرنا چاہیے اور ان سے تقاضا کرنا چاہیے کہ وہ غیر علم کے منحوس نتائج پر غور وفکر کریں ۔

(ب) اسلامی طرزِ تفکر اور اسلام کے اندازِ جہاں بینی کو لوگوں میں زندہ کرنا چاہیے تاکہ وہ جان سکیں کہ خدا ہر حالت میں لوگوں پر نگران ہے، وہ سمیع وبصیر ہے، یہاں تک کہ وہ ہمارے افکار ونظریات سے بھی آگاہ ہے ۔

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرِ﴾

وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو کچھ سینوں میں چھپاتے اس سے بھی وہ آگاہ ہے۔ (مومن/۱۹)

ہم جو بھی بات کرتے ہیں اور جو بھی قدم اٹھاتے ہیں ہمارے حساب میں لکھا جاتا ہے اور ہم اپنے اتمام اعمال، فیصلوں اور اعتقادات کے جوابدہ ہیں۔

(ج) رشدِ فکری کی سطح بلند کرنا چاہیے کیونکہ غیر علم کی پیروی عام طور پر آگاہ اور بے علم عوام کرتے ہیں کہ جو ایک بے بنیاد خبر سن کر فوراً اس سے چمٹ جاتے ہیں اور فیصلہ کرلیتے ہیں اور اسی کے مطابق پھر اقدام کرتے ہیں۔

۲۔ متکبر نہ بنو

اگلی آیت میں غرور وتکبر کے خلاف ہے، اس میں مومنین کو زندہ اور روشن تعبیر سے غرور کرنے کی ممانعت کی گئی ہے

۔

رسول اللہ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: روئے زمین پر غرور وتکبر سے نہ چلو ﴿وَلَاتَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾۔ (۵) کیونکہ تم ہرگز زمین کو چیز نہیں سکتے اور تمھارا لمبا قد پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتا ﴿إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مغرور لوگ عام طور پر چلتے وقت زمین پر زور زور سے پاؤں پٹختے ہیں تاکہ لوگوں کو بتائیں کہ ہم آرہے ہیں۔ گردن اوپر اکڑا کر رکھتے ہیں تاکہ اہلِ زمین پر بزعمِ خود اپنی برتری جتا سکیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ تم بھی زمین پر کیسے ہی اپنے پاؤں پٹخو، کیا اسے چیر سکو گے جبکہ اس کرہ خاکی پر تمہارا وجود بالکل ناچیز ہے۔ یہ تو بالکل اس چیونٹی کی طرح ہے جو بہت بڑے پتھر پر چل رہی ہو اور اپنا پاؤں اس پر پٹخے تو پتھر اس کی حماقت اور کم ظرفی پر ہنسے گا ہی۔

تو اپنی گردن کو جتنا بھی اکڑا لے کیا پہاڑوں کا ہمطراز ہوسکتا ہے اس طرح تو زیادہ سے زیادہ چند سنٹی میٹر اپنے تئیں اونچا کرسکتا ہے جبکہ اس زمین کے بلند ترین پہاڑوں کی چوٹی بھی اس کرہ کے مقابلے میں کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں رکھتی اور خود زمین پوری کائنات کے مقابلے میں ایک ذرہ بے مقدار ہے۔ پس تیرا یہ غرور وتکبر چہ معنی دارد؟

یہ امر قابل توجہ ہے کہ غرور وتکبر ایک خطرناک باطنی بیماری ہے لیکن قرآن نے براہِ راست اس پر بحث نہیں کی بلکہ اس کے ظاہری آثار میں سے بھی سادہ ترین اثرات کی نشاندہی کی ہے اور خود پسند بے مغز متکبروں اور مغروروں کی چال

کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تکبر و غرور اپنے کمترین آثار کی سطح پر بھی مذموم، ناپسندیدہ اور شرمناک ہے۔ نیزیہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی اندرونی صفات جو بھی ہوں وہ چاہے نہ چاہے ان کی جھلک اس کے اعمال میں ضرر نظر آجاتی ہے۔ اس کی چال ڈھال میں، اس کے دیکھنے کے اندر میں، اس کی بات کرنے کے طریقے میں اور اس کے تمام کاموں میں اس کی داخلی صفات جھلکتی ہیں۔ لہذا اگر ان صفات کا کچھ بھی اثر اعمال میں نظر آئے تو ہمیں متوجہ ہونا چاہیے کہ خطرہ نزدیک آگیا ہے اور ہمیں فکر کرنا چاہیے کہ اس مذموم عادت نے ہماری روح میں گھونسلا بنا لیا ہے لہذا ہمیں اس کے خلاف مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

ضمنی طور پر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث آیت میں (اسی طرح سورہ لقمان میں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں) قرآن کا ہدف یہ ہے کہ غرور و تکبر کی کلّی طور پر مذمت کی جائے نہ کہ اس کے کسی خاص موقع کی یعنی چلنے پھرنے کے انداز کی۔

کیونکہ غرور و تکبر خدا فراموشی، خود فراموشی، فیصلے میں اشتباہ، راہِ حق سے گمراہی، شیطان کے راستے سے وابستگی اور طرح طرح کے گناہوں سے آلودگی کا سرچشمہ ہے۔

حضرت علی علیہ السلام خطبہ "ہمام" میں پرہیزگاروں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: و مشیهم التواضع

اور ان کی چال ڈھال میں انکساری ہوتی ہے۔ [۶]

نہ صرف کوچہ بازار میں چلتے ہوئے ان میں انکساری ہوتی ہے بلکہ زندگی کے تمام امور میں یہاں تک کہ مطالعات فکری میں اور نظریات و افکار کے سفر میں انکساری ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔

ہادیانِ اسلام کی اپنی زندگی اس سلسلے میں ہر مسلمان کے لیے بہت ہی سبق آموز اور نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ ہرگز اجازت نہیں دیتے تھے کہ جس وقت آپ سوار ہوں تو کچھ لوگ پیادہ آپ کے ہمرکاب چلیں بلکہ فرماتے تھے:

تم فلاں جگہ پہنچو، میں بھی آجاؤں گا۔ وہاں ملاقات ہوگی پیادہ شخص کا سوار کے ساتھ چلنا سوار کے غرور اور پیادہ کی ذلت کا سبب بنتا ہے۔

نیز ہم بڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین پر بیٹھتے، غلاموں کی سی سادہ غذا کھاتے، بکری کا دودھ دوہتے اور گدھے کی ننگی پشت پر سوار ہوتے۔

یہاں تک کہ جب آپ کے اقتدار کا زمانہ تھا مثلاً فتح مکّہ کے دن بھی اسی طرح کے کام انجام دیتے تھے تاکہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ کسی مقام پر پہنچنے سے غرور پیدا ہوگیا ہے اور آپ کوچہ و بازار کے لوگوں اور مستضعفین سے الگ رہنے لگے ہیں اور محنت کش عوام سے بیگانہ ہوگئے ہیں ۔

حضرت علی علیہ السلام کے حالات میں بھی ہے کہ آپ گھر کے لیے خود پانی بھرتے اور بعض اوقات گھر میں جھاڑو دیتے ۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے حالات میں ہے کہ کئی سواریاں آپ(ص) کے پاس تھیں اس کے باوجود آپ(ص) بیس مرتبہ پا پیادہ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے ۔ آپ(ص) فرماتے تھے:

میں ایسا بارگاہِ الٰہی میں عجزو انکساری کے لیے کرتا ہوں ۔ (۷)

اگلی آیت میں گزشتہ آیات میں بیان کیے گئے احکام پر تاکید کی گئی ہے ۔شرک، قتل نفس، زنا، قتلِ اولاد، مالِ یتیم میں تصرف اور ماں باپ کو آزار پہنچانے کے بارے میں فرمایا گیا ہے:ان تمام کا گناہ تیرے پروردگار کے نزدیک قابلِ نفرت ہے﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا﴾ ۔ (۸)

اس تعبیر سے واضح ہوجاتا ہے کہ مکتب جبر کے پیرو کاروں کے قول کے برخلاف خدا نے ہرگز ارادہ نہیں کیا کہ کسی سے گناہ سرزد ہو اگر اس نے ایسا ارادہ کیا ہوتا تو اس آیت میں اس سے کراہت اور ناراضگی مناسب نہ تھی۔

ضمناً واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کی زبان میں بہت بڑے گناہوں کے لیے بھی لفظ مکروہ استعمال ہوا ہے ۔

۳۔ مشرک نہ بنو

تاکید مزید کے لیے اور اس لیے کہ ان تمام حکیمانہ احکام کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے فرمایا گیا ہے: یہ سب حکمت آمیز احکام ہیں کہ جن کی تیرے پروردگار نے تیری طرف وحی کی ہے﴿ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ ۔

”حکمت“ کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ان آسمانی احکام کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اس کے علاوہ یہ میزان عقل پر بھی بالکل پوری اترتے ہیں اور عقل کے مطابق قابل ادراک ہیں ۔

کون شخص شرک، قتل نفس یا ماں باپ کو آزار پہنچانے کی قباحت کا انکار کر سکتا ہے ۔ اسی طرح کون زنا تکبر، یتیموں پر ظلم اور پیمان شکنی کے منحوس نتائج کا انکار کر سکتا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں، یہ احکام عقلی کے ذریعے بھی ثابت شدہ ہیں اور وحی الٰہی کے ذریعے سے بھی اور تمام احکام الٰہی کے اصول اسی طرح ہیں اگرچہ عقل کے کم فروغ چراغ سے ان کی تفصیلات کو اکثر اوقات مشخص نہیں کیا جاسکتا اور صرف وحی الٰہی کے طاقتوں نور ہی سے انہیں پہنچانا جاسکتا ہے۔

بعض مفسرین نے حکمت کی تعبیر سے یہ استفادہ بھی کیا ہے کہ متعدد احکام جو گزشتہ آیات میں گزرے ہیں ثابت، مستحکم اور ناقابل تنسیخ ہیں اور یہ تمام آسمانی ادیان میں تھے۔ مثلاً شرک، قتل نفس، زنا، پیمان شکنی ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جو کسی بھی مذہب میں جائز شمار ہوتی ہوں۔ پس یہ احکام محکمات اور قوانین ثابت کا حصہ ہیں۔ اس کے بعد جس طرح ان احکام کی ابتداء تحریم شرک سے کی گئی ہے حرمت شرک کی تاکید کے ساتھ ان کا اختتام ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: خدائے یگانہ کے ساتھ ہرگز شریک کا قائل نہ ہونا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود قرار نہ دینا ﴿وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللهِ إِلٰهًا آخَرَ﴾۔

کیونکہ اس امر کے سبب تو دوزخ میں جا گرے گا جبکہ مخلوق خدا کی ملامت بھی تجھے دامن گیر ہوگی اور بارگاہ الٰہی سے بھی تو دھتکارا جائے گا اور اس کا قہر و غضب بھی تجھے لاحق ہوگا۔ ﴿فَتُلْقَى فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَدْحُورًا﴾۔

درحقیقت تمام انحرافات، جرائم اور گناہوں کا خمیر شرک اور دوگانہ پرستی سے اٹھتا ہے۔ اسی لیے اسلام کے اساسی احکام کا یہ سلسلہ حرمتِ شرک سے شروع ہوتا ہے اور تحریمِ شرک پر ہی تمام ہوتا ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں مشرکین کی ایک بیہودہ خرافاتی فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے پایہ منطق اور سطح فکر کو واضح کیا گیا ہے۔ ان میں سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں حالانکہ خود بیٹی کا نام سن کر شرم محسوس کرتے تھے اور اپنے گھر میں اس کی ولادت کو بدبختی کا باعث خیال کرتے تھے قرآن مجید خود انہی کی منطق کی زبان میں انہیں جواب دیتا ہے: کیا تمہارے پروردگار نے بیٹے صرف تمہارے حصّے میں دے دیئے ہیں اور خود اپنے لیے اس نے فرشتوں میں سے بیٹیاں لے لی ہیں ﴿أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا﴾۔

اس میں شک نہیں کہ بیٹیاں بھی بیٹوں کی طرح نعماتِ الٰہی ہیں اور انسانی قدر و قیمت کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ اصولی طور پر بقائے نسل انسانی ان دونوں میں سے کسی ایک کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کو جو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہ بیہودہ، فضول اور خرافاتی فکر تھی۔ اس کا پس منظر کیا تھا، اس کے بارے میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ (۹)

لیکن قرآن کا مقصد یہ ہے کہ انہیں ان ہی کی منطق کے ذریعے مغلوب کرے کہ تم کیسے نادان لوگ ہو کہ اپنے پروردگار کے لیے ایسی چیز کا نظریہ رکھتے ہو جس سے خود تم عار محسوس کرتے ہو۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں ایک قاطع اور یقینی حکم کی صورت میں فرمایا گیا ہے: تم بہت بڑی اور کفر آمیز بات کرتے ہو ﴿إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا﴾ ۔ ایسی بات جو کسی منطق سے مناسبت نہیں رکھتی اور کئی حوالوں سے بے بنیاد ہے مثلاً:

۱۔ خدا کی اولاد ہونے کا اعتقاد اس کی ساحتِ مقدس میں ایک بہت بڑی اہانت ہے کیونکہ نہ وہ جسم ہے نہ عوارض جسمانی رکھتا ہے اور نہ بقائے نسل کا محتاج ہے۔ لہٰذا اس کے لیے اولاد کا اعتقاد صرف اس کی پاکیزہ صفات کو نہ پہچاننے کی وجہ سے ہے۔

۲۔ تم خدا کی ساری اولاد بیٹیوں میں منحصر کیوں سمجھتے ہو جبکہ بیٹی کے لیے بہت پست قدر و منزلت کے قائل ہو۔ تمہارے خیالات کے لحاظ سے یہ احمقانہ اعتقاد خدا کی بارگاہ میں ایک اور اہانت ہے۔

۳۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے مقام کی بھی توہین ہے، جبکہ وہ فرمانِ حق پر قائم ہیں اور مقربِ بارگاہِ الٰہی ہیں۔ خود بیٹی کے نام سے گھبرا جاتے ہو لیکن ان سب مقربانِ الٰہی کو بیٹی فرض کرتے ہو۔

ان امور کی جانب توجہ سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ یہ بات ایک بہت بڑی بات ہے۔ واقعات سے انحراف کے لحاظ سے بڑی ہے کہ تم معصوم بیٹیوں کی تحقیر و تذلیل کرتے ہو اور ان کے احترام میں کمی کرتے ہو۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب، فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں خیال کرتے تھے۔ اسی طرح زمانہ جاہلیت کے عرب بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کرتے تھے اور ان کے نام سے وحشت کیوں کرتے تھے نیز دوسری طرف اسلام نے عورت کو کیا مقام و منزلت عطا کیا اور کس طرح سے صنفِ عورت کی تذلیل کے نظریات کا مقابلہ کیا۔ ان تمام امور پر تفصیلی بحث تفسیر نمونہ جلد ۱۱، سورہ نحل آیات ۵۷ تا ۵۹ کے ذیل میں آچکی ہے۔

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۱۶ -۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۱۷ -۳۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۳۸ -۴۔ نور الثقلین، ج ۳، ص ۱۶۴ -

۵۔ "مَرَح" (بروزن "فَرَح") ایک باطل اور بے بنیاد بات پر بہت زیادہ خوشی کے معنی میں ہے۔ ۶۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳ -۷۔ تفسیر نونہ جلد ۶ میں بھی غرور و تکبر کے نقصان کے بارے میں گفتگو کر چکے ہیں (دیکھیے اردو ترجمہ) ۸۔ "سیہ" کی ضمیر "ذٰلک" یا "کل" کی طرف لوٹتی ہے اور یہ ان الفاظ کے مفرد ہونے کی وجہ سے مفرد ہے اگرچہ یہاں جمع کے معنی رکھتی ہے۔ ۹۔ تفسیر نونہ، ج ۱۱، سورہ نحل کی آیات ۵۸ و ۵۹ کے ذیل میں دیکھئے۔

آیات ۴۴،۴۳،۴۲،۴۱

۴۱ ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِی هٰذَا الْقُرْآنِ لِیَذَّکَّرُوا وَمَا یَزِیدُهُمْ إِلاَّ نُفُورًا﴾

۴۲ ﴿قُلْ لَوْ کَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ کَمَا یَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلیٰ ذِی الْعَرْشِ سَبِیلًا﴾

۴۳ ﴿سُبْحَانَهُ وَتَعَالیٰ عَمَّا یَقُولُونَ عُلُوًّا کَبِیرًا﴾

۴۴ ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِیهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَیْءٍ إِلاَّ یُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَکِنْ لَاتَفْقَهُونَ تَسْبِیحَهُمْ إِنَّهُ کَانَ حَلِیمًا غَفُورًا

﴾ترجمہ

۴۱۔ ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے مؤثر طورپر بیان کیا تاکہ وہ کسی طرح سمجھیں لیکن (جن کے دل اندھے تھے) ان میں نفرت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔

۴۲۔ کہہ دو: اگر اس کے ساتھ اور خدا ہوتے، جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو وہ کوشش کرتے کہ مالک عرش خدا کی طرف کوئی راہ نکالیں۔

۴۳۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ اس سے پاک و برتر ہے، بہت ہی برتر۔

۴۴۔ سات آسمان اور زمین اور جو اس میں ہیں۔ سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور ہر موجود اس کی تسبیح اور حمد کرتا ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ وہ حلیم اور بخشنے والا ہے۔

وہ حق سے کیونکر فرار کرتے ہیں؟

گزشتہ آیات میں گفتگو مسئلہ توحید پر تمام ہوئی۔ زیر بحث آیات میں واضح اور قاطع اندازہ میں اسی مسئلے پر تاکید کی جارہی ہے۔

پہلے تو توحید کے مختلف دلائل کے سامنے ایک گروہ مشرکین کی انتہائی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس قرآن میں بہت سے استدلال پیش کیے اور طرح طرح سے مؤثر طورپر بیان کیا تاکہ وہ سمجھیں اور راہ حق میں قدم اٹھائیں لیکن ان سب استدلال اور بیانات پر انہوں نے فرار ہی کیا اور ان کی نفرت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِی هٰذَا الْقُرْآنِ لِیَذَّکَّرُوا وَمَا یَزِیدُهُمْ إِلاَّ نُفُورًا﴾۔

"صرّف" مادہ "تصریف" سے تبدیل کرنے اور دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے ۔ خصوصاً اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ بابِ تفعیل سے ہے، کثرت کا مفہوم اس میں پنہاں ہے ۔

قرآن میں توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے لیے کبھی منطقی استدلال پیش کیا گیا ہے، کبھی برہان فطرت سے کام لیا گیا ہے، کبھی تہدیہ کی صورت اپنائی گئی ہے اور کبھی تشویق کی راہ اختیار کی گئی ہے خلاصہ یہ کہ مشرکین کو بیدار اور آگاہ کرنے کے لیے کلام کے مختلف طریقوں اور فنوں سے استفادہ کیا گیا ہے لہٰذا "صرفنا" کی تعبیر اس مقام پر بہت ہی مناسب ہے ۔

اس تعبیر کے ذریعے قرآن کہتا ہے: ہم ہر دروازے سے وارد ہوئے اور ہم نے ہر راستے سے استفادہ کیا تاکہ ان کے اندھے دلوں میں توحید کا چراغ روشن کردیں لیکن ان میں سے ایک گروہ اس قدر ہٹ دھرم، متعصب اور سخت ہے کہ نہ صرف ان بیانات سے وہ حقیقت کے قریب نہیں ہوئے الٹا ان کی نفرت اور دوری میں اضافہ ہوا ہے ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بیانات کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے تو پھر ان کے ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ قرآن ایک خاص گروہ کے لیے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ سارے انسانی معاشرے کے لیے ہے اور مسلّم ہے کہ سب انسان تو ایسے نہیں ہیں ۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ وہ یہ دلائل سنتے ہیں تو راہِ حق ان پر آشکار ہوجاتی ہے ۔ ان تشنگانِ حقیقت کا ہر دستہ قرآن کے کسی ایک طرح کے بیان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور بیدار ہوجاتا ہے اور ان آیات کے نزول کا یہی اثر کافی ہے اگرچہ کوردِل اس سے الٹا اثر لیتے ہیں ۔

علاوہ ازیں اس متعصب اور ہٹ دھرم گروہ کا راستہ اگرچہ غلط ہے اور یہ خود بد بخت ہیں لیکن حق طلب افراد ان سے اپنا موازنہ کرکے راہ حق کو بہتر طور پر پاسکتے ہیں کیونکہ نور ظلمت کے مقابلے سے نور کی قیمت بیشتر معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ بے ادبوں سے بھی سیکھا جاسکتا ہے ۔

ضمنی طور پر اس آیت سے تربیت اور تبلیغ مسائل کے سلسلے میں یہ درس لیا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ تربیتی اہداف و مقاصد تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی طریقے سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ مختلف اور طرح طرح کے وسائل سے استفادہ کیا جانا چاہئے کیونکہ استعداد مختلف ہوتی ہے ۔ ہر ایک پر اثر انداز ہونے کے لیے خاص انداز ہونا چاہیے ۔ فنونِ بلاغت میں سے ایک یہ اسلوب ہے ۔

دلیل تمانع

اگلی آیت توحید کی ایک دلیل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو علماء اور فلاسفہ میں "دلیل تمانع" کے نام سے مشہور ہے۔
ارشاد ہوتا ہے: اے رسول! ان سے کہہ دو: اگر خداوند قادر متعال کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے، جیسا کہ تمہارا خیال ہے، تو وہ خدا کوشش کرتے کہ خدائے عظیم صاحب عرش تک پہنچنے کی کوئی راہ نکالیں اور اس پر غلبہ حاصل کرلیں ﴿قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا﴾۔
"﴿إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا﴾" کا مفہوم اگرچہ یہ ہے کہ "وہ صاحب عرش کی طرف راہ نکالتے" لیکن طرز بیان نشاندہی کرتا ہے کہ مراد اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرنا ہے۔ خصوصاً "اللہ" کے بجائے "ذی العرش" کی تعبیر اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی وہ بھی چاہتے کہ عرش اعلیٰ کے مالک بن جائیں اور سارے جہان ہستی پر حکومت کریں۔ لہٰذا اس سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔
بہر حال یہ امر فطری اور طبیعی ہے کہ ہر صاحب قدرت چاہتا ہے کہ اپنے اقتدار کامل کرے اور اپنے قلمرو حکومت کو توسیع دے اور اگر سچ مچ کوئی خدا موجود ہوتے تو توسیع حکومت کا یہ تنازع اور تمانع ان میں رونما ہوتا۔ (۱)
لیکن اگلی آیت کی تعبیرات اور بعد کی آیت اس تفسیر سے ہرگز مناسبت نہیں رکھتیں۔
ممکن ہے کہا جائے کہ کونسا مانع ہے اور کیا حرج ہے کہ متعدد خدا ایک دوسرے کے ساتھ ہمکاری اور تعاون کرتے ہوئے اس عالم پر حکومت کریں اور کیا ضروری ہے کہ وہ آپس میں جھگڑیں۔
اس سوال کے جواب میں اس حقیقت کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ اگرچہ ہر موجود کے لیے تکامل اور توسیعِ اقتدار سے لگاؤ فطری اور طبیعی ہے اور یہ بھی کہ جن خداؤں کا مشرکین عقیدہ رکھتے تھے وہ بہت سی بشری صفات کے حامل تھے کہ جن میں حکومت و قدرت سے لگاؤ ایک زیادہ واضح صفت ہے لیکن ان سب امور سے قطع نظر اختلاف تعدّدِ وجود کا لازمہ ہے کیونکہ اگر کسی رویّے، پروگرام اور دیگر پہلوؤں سے کوئی اختلاف نہ ہو تو تعدّد کا کوئی معنی ہی نہیں اور دونوں ایک چیز ہوں گے (غور کیجیے گا)۔
اس بحث کی نظیر سورہ انبیاء کی آیت ۲۲ میں بھی موجود ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:
﴿لَوكَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ الّا الله لَفَسَدَتَا﴾
اگر زمین و آسمان میں "اللہ" کے علاوہ اور وہ خدا ہوتے تو نظام جہاں دگرگوں اور فاسد ہوجاتا۔

اشتباہ نہیں ہونا چاہیے، یہ دونوں بیان بعض جہات سے اگرچہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن دو مختلف دلیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک کی خداؤں کے تعدد کی وجہ سے نظام جہاں کے فساد کی طرف بازگشت ہے اور دوسری نظام جہاں سے قطع نظر متعدد خداؤں کے درمیان وجود تمانع و تنازع کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔

(سورہ انبیاء کی آیہ ۲۲ کے ذیل میں بھی ہم انشاء اللہ اس سلسلے میں بحث کریں گے)

چونکہ مشرکین کہتے ہیں کہ خدائے بزرگ نے ایک طرف نزاع کیا ہے لہٰذا اگلی آیت میں بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: جو کچھ وہ کہتے ہیں خدا اس سے پاک اور منزہ ہے اور جو کچھ وہ سوچتے ہیں خدا اس سے بہت برتر اور بالاتر ہے (سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالیٰ عَمَّا یَقُولُونَ عُلُوًّا کَبِیرًا)۔

اس مختصر سے جملہ میں حقیقت اللہ تعالیٰ نے چار مختلف تعبیروں سے ناروا نسبتوں سے اپنے دامن کبریایی کی پاکیزگی بیان کی ہے:

۱۔ خدا ان نقائص اور ناروا نسبتوں سے منزہ ہے﴿سُبْحَانَهُ﴾

۲۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ اس سے بالاتر ہے﴿وَتَعَالىٰ عَمَّا يَقُولُونَ﴾

۳۔ لفظ "علواً" مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے۔

۴۔ اور آخر میں "کبیراً" کہہ کر مزید تاکید کی گوئی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "عما یقولون" (جو کچھ وہ کہتے ہیں)۔ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں ان کی تمام ناروا نسبتیں اور ان کے لوازم شامل ہیں (غور کیجیے گا)۔

اس کے بعد پروردگار کا مقام عظمت بیان کیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے وہم و خیال سے برتر ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ موجود جہاں اس کی ذات مقدس کی تسبیح کرتی ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ﴾۔ اس کے باوجود خود حلیم و غفور ہے﴿إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾۔

تمہارے کفر اور شرک پر اللہ تمہارا فوری مواخذہ نہیں کرتا بلکہ کافی مہلت دیتا ہے اور تمہارے لیے توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے تاکہ اتمام حجت ہوجائے۔

دوسرے لفظوں میں تم یہ صلاحیت رکھتے ہو کہ عالم کے تمام ذرات میں سے سن سکو کہ موجودات تسبیح الٰہی کا نغمہ گنگنا رہے ہیں اور تم اس قابل ہو کہ خدائے یگانہ قادر متعال کی معرفت حاصل کر سکو لیکن تم کوتاہی کرتے ہو اور اس

کوتاہی کے باوجود وہ فوراً مواخذہ اور عذاب نہیں کرتا اور تمہیں زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرتا ہے کہ تم توحید کی شناخت کر سکو اور راہ شرک ترک کرسکو۔

۱۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ دوسرے خدا کوشش کرتے کہ اپنے آپ کو "اللہ" کی بارگاہ میں مقرب بنائیں یعنی یہ تمھارے بُت اور خدا جب خود اللہ کا تقرب حاصل نہیں کرسکتے تمھارے تقرب کا وسیلہ کیسے بن سکتے ہیں۔

موجودات عالم کی عمومی تسبیح

قرآن کی مختلف آیات میں یہ بات آئی ہے کہ عالم ہستی کے موجودات خدائے عظیم کی تسبیح اور حمد کرتے ہیں ۔ ان سب آیات میں شاید زیادہ صریح زیرِ بحث آیت ہے ۔ اس آیت کے مطابق عالم ہستی کے تمام موجودات بلا استثناء مصروف تسبیح ہیں ۔ اس کے مطابق زمین، آسمان، ستارہ، کہکشاں ، انسان، حیوان، نباتات یہاں تک کہ ایٹم کے چھوٹے چھوٹے ذرّات بھی اس عموی تسبیح و حمد میں شریک ہیں ۔

قرآن کہتا ہے عالم ہستی سرتا پا زمزمہ و نغمہ ہے ۔ ہر موجود ایک طرح سے حمد و ثنائے حق میں مشغول ہے ۔بظاہر خاموش عالم ہستی کے صحن میں مسلسل ایک نغمہ ہے ۔ بے خبر لوگ اسے سننے کی توانایی نہیں رکھتے لیکن وہ صاحبان فکر و نظر جن کا قلب و روح نور ایمان سے زندہ اور روشن ہے ہر طرف سے کان اور جان سے یہ صدا سن رہے ہیں ۔ بقول شاعر:

۱۔گر تو را از غیب چشمی باز شد با تو ذراتِ جہاں ہمراہ شد

۲۔نطق آب و نطق خاک و نطق گل ہست محسوس حواس اہلِ دل!

۳۔جملہ ذرّات در عالم نہاں با تو می گویند روزان و شباں

۴۔ ما سمیم و بصیر و باہشیم با شما نامحرمان ما خامشیم!

۵۔ از جمادی سوئ جان جاں شوید غلغل اجزای عالم بشنوید

۶۔فاش تسبیح جمادات آیدت وسوسہ ی تاویلھا بزدایدت

۱ ۔ اگر تجھے نگاہ غیب حاصل ہو جائے تو ذرات عالم تجھ سے باتیں کرنے لگیں ۔

۲ ۔ پانی، خاک اور مٹی کا بولنا اہلِ دل محسوس کرتے ہیں ۔

۳۔ سارے عالم کے موجودات چپکے چپکے شب و روز تجھ سے کہتے ہیں ۔

۴۔ وہ سنتے ہیں ، دیکھتے ہیں اور باہوش ہیں البتہ تم نا حرموں سے بات نہیں کرتے ۔

۵۔ ایک جماد بے جاں سے جانِ جاں ہوجاؤ تو اجرائے عالم کا غلغلہ سنو۔

۶۔جمادات کی تسبیح تمہیں صاف سنائی دے گی اور تاویلوں کا وسوسہ کم کردے گی۔

اس حمد و تسبیح کی حقیقت کے بارے میں فلاسفہ اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے ۔ بعض نے اسے "حالی" کہا ہے اور بعض نے "قالی" ہمارے نزدیک اان کے جو قابلِ قبول نظریات ہیں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے ۔

۱ ۔ ایک گروہ کا نظریہ ہےں کہ اس جہان کے سب ذرّات انہیں ہم عاقل سمجھیں یا غیر عاقل ایک قسم کے ادراک اور شعور کے حامل ہیں اگرچہ ہم میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ادراک و احساس کی کیفیت سمجھ سکیں اور ان کی حمد و تسبیح سن سکیں ۔

وہ مختلف آیات اپنے نظریے کا شاہد قرار دیتے ہیں ، مثلاً:

﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ﴾

بعض پتھر خوفِ خدا سے پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے گر جاتے ہیں ۔ (بقرہ ۔ ۷۴)

﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾

اللہ نے آسمان و زمین سے فرمایا طوعاً یا کرہاً میرے فرمان کی طرف آؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم اطاعت کا راستہ اپنائیں گے ۔ (حٰم آلسّجدہ ۔ ۷۴)

۲ ۔ بہت سوں کا نظریہ ہے کہ یہ تسبیح اور حمد وہی چیز ہے جسے ہم "زبان حال" کہتے ہیں ۔ یہ تسبیح حقیقی ہے نہ کہ مجازی لیکن زبانِ حال سے ہے نہ کہ زبان قال سے (غور کیجئے گا) ۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کے چہرے اور آنکھوں سے تکلیف ، رنج و غم اور بے خوابی نمایاں ہو تو ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ تم اپنی تکلیف اور رنج و غم کے بارے میں زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم کل رات نہیں سوئے اور تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے کہ تم کسی جان کاہ رنج و غم سے گزر رہے ہو ۔ یہ زبان حال کبھی اس قدر قوی ہوتی ہے کہ زبان قال سے انکار چھپانے کی کوشش بھی کی جائے تو حقیقت چھپ نہیں سکتی ۔ بقول شاعر:

گفتم کہ با مکرو فسوں پنہاں کنم رازِ دروں

پنہاں نمی گردو کہ خون از دیدگانم می رود

میں نے چاہا کہ کسی حیلے سے رازِ دروں چھپا لوں ۔

لیکن وہ نہیں چھپتا کیونکہ میری آنکھوں سے خون جاری ہے ۔

یہی بات حضرت علی علیہ السلام اپنے مشہور جملے میں فرماتے ہیں:

ما اضمر احد شیئاً الاظهر فی فلتات لسانه و صفحات وجهه

کوئی شخص اپنے دل کا بھید نہیں چھپاتا مگر یہ کہ لا علمی میں اس کی گفتگو کے دوران اور اس کے چہرے کے صفحہ پر آشکار ہوجاتا ہے۔ (۲)

کیا انکار کیا جاسکتا ہے کہ عظیم نامور شعراء کا دیوان ان کے ذوقِ ادراک اور طبیعت عالی کی حکایت کرتا ہے اور ہمیشہ صاحبِ دیوان کی تعریف کرتا ہے۔ کیا انکار کیا جاسکتا ہے کہ عظیم عمارتیں اور بڑے بڑے کاخانے اور پیچیدہ کمپیوٹر وغیرہ زبانی سے اپنے موجد کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی حد تک اپنے موجد کی ستائش کرتا ہے۔

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ عجیب و غریب عالم ہستی اپنے عجیب نظام، اسرار، خیرہ کن عظمت اور حیرت انگیز باریکیوں کے ساتھ خدا کی تسبیح و حمد کرتا ہے۔

کیا "تسبیح" عیوب سے پاک شمار کرنے کہ علاوہ کچھ اور ہے؟ اس عالم ہستی کے ساخت اور اس کا نظم اور نسق ہوتا ہے کہ اس کا خالق ہر قسم کے نقص اور عیب سے مبرا اور منزہ ہے۔

کیا حمد و ثنا صفات کمال بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟ جہان آفرینش کا نظام۔ اللہ کی صفات کمال، اس کے بے پایان علم، بے انتہا قدرت اور وسیع اور ہمہ گیر حکمت کی حایت کرتا ہے۔

مخصوصاً سائنس و اور علم و دانش کی پیشرفت سے اور اس وسیع عالم کے اسرار کے بعض گوشوں سے پردہ اٹھنے سے موجودات عالم کی یہ عمومی حمد و تسبیح زیادہ آشکار ہوئی ہے۔

اگر ایک دن کوئی نکتہ پرداز شاعر سبز و درختوں کے ہر پتے کو معرفت پروردگار کا ایک دفتر سمجھتا تھا تو آج کے ماہرین نباتات اور سائنس دانوں نے ایک دفتر نہیں بلکہ کئی کتابیں لکھی ہیں آج ان ماہرین نے پتوں کے چھوٹے سے چھوٹے اجرا کی حیرت انگیز ساخت پر بحث کی ہے۔ پتوں کے اجرائے حیات، cellules سے لے کر ان کی سات تہوں، ان کے تنفس کے نظام، آب غذا کے حصول کے لیے ان کے رشتے ناتوں پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کئی پیچیدہ پتوں کی خصوصیات پر بھی ایسی کتابوں میں بحث کی گئی ہے۔

لہٰذا ہر پتہ شب و روز مزمہ توحید گنگناتا ہے۔ پتوں کی تسبیح کی دلنشین آواز باغوں، کہساروں اور درّوں کے پُرپیچ راستوں میں گونج رہی ہے لیکن بے خبر لوگوں کو کچھ نہیں آتا وہ انہیں خاموش اور گونگا سمجھتے ہیں۔

موجودات کی عمومی تسبیح و حمد کا یہ مفہوم پوری قابلِ فہم ہے اور ضروری نہیں کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ عالم ہستی کے تمام ذرّات ادراک و شعور رکھتے ہیں کیونکہ اس بات کے لیے ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے او رزیادہ احتمال یہی ہے کہ مذکورہ آیات اسی "زبانِ حال" کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار۲۶۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر تسبیح و حمد سے مراد یہ ہے کہ نظامِ آفرینش خدا کی پاکیزگی، عظمت، قدرت اور صفات ثبوتیہ و سلبیہ کی حکایت و ترجمانی کرتا ہے تو پھر قرآن کیوں کہتا ہے کہ تم ان کی حمد و تسبیح نہیں سمجھتے کیونکہ بعض لوگ نہیں سمجھتے تو کم از کم علماء او ردانشمند تو سمجھتے ہیں۔

اس سوال کے دو جواب ہیں:

پہلا یہ کہ روئے سخن لوگوں کی نادان اکثریت خصوصاً مشرکین کی طرف ہے اور صاحب ایمان علماء کہ جو اقلیت میں ہیں اس عموم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ہر عام میں استثناء ہے۔

دوسرا یہ کہ اسرار عالم میں سے جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کہ جسے ہم نہیں جانتے سمندر کے مقابلے میں قطرے کی مانند ہے اور عظیم پہاڑ کے مقابلے میں ذرّے کی طرح ہے۔ اگر کسی میں صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو اسے علم و دانش کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔

تا بدانجا رسید دانش من کہ بدانستی کہ نادانم!

میرا علم یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ میں نہیں جانتا۔

اس بناء پر اگر ہم عالم بھی ہوں تو بھی ان موجودات کی حمد و تسبیح نہیں پہچانتے کیونکہ جو کچھ ہم سُن رہے ہیں وہ ایک عظیم کتاب کا ایک لفظ ہے۔ اس لحاظ سے ایک عمومی حکم کے طور پر یہ سب لوگوں سے خطاب ہے کہ عالم ہستی کی موجودات زبانِ حال سے جو تسبیح و حمد کرتے ہیں تم انہیں نہیں سمجھتے کیونکہ جو کچھ تم سمجھتے ہو وہ اس قدر ناچیز او رحقیر ہے کہ کسی حساب و شمار ہی میں نہیں آتا۔

۳۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں موجودات کی عمومی تسبیح و حمد زبانِ حال اور زبانِ قال دونوں کا مرکب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تسبیح "تسبیح تکوینی" بھی ہے اور "تسبیح تشریعی" بھی کیونکہ بہت سے انسان اور تمام فرشتے ادراک و شعور کے ساتھ اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور باقی تمام موجودات کے ذرّے بھی اپنی زبانِ حال سے خالق کی عظمت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کی حمد و تسبیح اگرچہ آپس میں فرق رکھتی ہے لیکن حمد و تسبیح کے وسیع مفہوم میں دونوں مشترک ہیں لیکن جیسا کہ واضح ہے دوسری تفسیر اس تشریح کے ساتھ کہ جو ہم نے بیان کی سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

اھل بیت (ص) سے چند روایات

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں ان میں جاذبِ نظر تعبیرات دکھائی دیتی ہیں۔

امام صادق علیہ السلام کا ایک صحابی کہتا ہے: میں نے آیہ "وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلاَّ یُسَبِّحُ بِحَمْدِہِ" کے متعلق سوال کیا تو آپ (ص) نے جواب میں فرمایا: کل شیء یسبح بحمده وانا لنریٰ أن ینقض الجدار وهو تسبیحه-

جی ہاں ہر چیز خدا کی تسبیح و حمد کرتی ہے۔یہاں تک کہ جب دیوار گر رہی ہوتی ہے اور اس کے گرنے کی آواز ہمیں سنائی دے رہی ہوتی ہے تو وہ بھی تسبیح ہوتی ہے۔ (۱)

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

نهی رسول الله عن ان توسهم البهائم فی وجوهها، وأن تضرب وجوهها لأنّها تسبح ربه-

رسول اللہ نے فرمایا کہ جانوروں کے منہ نہ داغو اور ان کے منہ پر تازیانہ نہ مارو کیونکہ خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں (۲)

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:ما من طیر یصاد فی بر ولابحر ولا شیء یصاد من الوحش الّا بتضیعه التسبیح-

کوئی پرندہ صحرا و دریا میں شکار نہیں ہوتا اور کوئی جانور دام صیاد میں نہیں پھنستا مگر تسبیح ترک کرنے سے۔ (۳)

امام باقر علیہ السلام نے چڑیا کی آواز سنی تو فرمایا: جانتے ہو یہ کیا کہتی ہیں؟

ابو حمزہ ثمالی جو آپ کے خاص اصحاب میں سے تھے نے عرض کیا: نہیں۔

اس پر آپ (ص) نے فرمایا:یسبحن ربهن عزوجل و یسئلن قوت یومهن

یہ خدائے عزوجل کی تسبیح کرتی ہیں اور اس سے دن کی روزی مانگتی ہیں۔ (۴)

ایک اور حدیث میں ہے:

ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم حضرت عائشہ کے پاس آئے۔ فرمایا: میرے یہ دونوں کپڑے دھو ڈالو۔ کہنے لگیں: یا رسول اللہ! کل میں نے انہیں دھویا تھا۔

رسول اللہ نے فرمایا:اما علمت ان الثوب یسبحن فاذا اتسخ انقطع تسبیحہ۔

کیا جانتی نہیں ہو کہ کپڑے تسبیح کرتے ہیں اور جب میلے ہوجائیں تو ان کی تسبیح رُک جاتی ہے۔ [۵]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ(ص) نے فرمایا:

للدابة علی صاحبها ستة حقوق لا یحملها فوق طاقتها، ولا یتخذ ظهرها مجلساً یتحدث علیها، و یبدء بعلفها اذا نزل، ولا یسمها فی وجهها، ولا یضربها فانها تسبح و یعرض علیها الماء اذا مربها۔

جانور اپنے مالک پرچھ حق رکھتا ہے:

۱۔ اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار نہ لادے۔

۲۔ اس کی پشت کو باتیں کرنے کی مجلس نہ بنائے (بلکہ جب کسی سے سرِراہ ملاقات ہوجائے اور اس سے باتیں کرنا چاہے تو سواری سے اتر کرے اور بات چیت ختم ہوجائے تو سوار ہوکر چل دے)۔

۳۔ جس منزل پر پہنچے اسے پہلے چارہ مہیا کرے۔

۴۔ اس کے منہ کو نہ داغے۔

۵۔ اور نہ اس کے منہ پر مارے کیونکہ وہ خدا کی تسبیح کرتا ہے۔

۶۔ اور چشمہ آب یا ایسی کسی جگہ سے گزرے تو اسے پانی کے پاس لے جائے(تاکہ اگر وہ پیاسا ہے تو پانی پی لے)۔ [۶]

مجموعی طورپر یہ روایات کہ جن میں سے بعض دقیق اور باریک معانی کی حامل ہیں، نشاندہی کرتی ہیں کہ موجودات کی تسبیح و الا عام حکم بلا استثناء سب چیزوں پر محیط ہے اور یہ سب چیزیں مذکورہ بالا دوسری تفسیر(تفسیر تکوینی اور زبان حال کے معنی میں تسبیح) سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں اور یہ جو ان روایات میں ہے کہ جس وقت لباس کثیف ہوجاتا ہے تو اس کی تسبیح رُک جاتی ہے، ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ جب تک موجودات طبیعی حالت میں اور پاک صاف ہوں تو انسان کو یاد الٰہی میں ڈالتی ہیں۔ لیکن جب طبیعی حالت میں اور پاک صاف نہ ہوں تو پھر یاد کا یہ سلسلہ باقی نہیں رہتا۔

آیات ۴۴،۴۵،۴٦،۴۷

۴۴﴿وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَايُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا﴾

۴۵﴿وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا﴾

۴٦﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا﴾

۴۷﴿انظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَايَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا﴾

ترجمہ

۴۵۔ اور جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک غیر محسوس حجاب پیدا کردیتے ہیں۔

۴٦۔ اور ہم ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیتے ہیں تاکہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی (پیدا کردیتے ہیں) اور جب تو قرآن میں اپنے پروردگار کو تنہا یاد کرتا ہے تو پشت کرلیتے ہیں اور تجھ سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔

۴۷۔ اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کیوں تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں اور جب وہ آپس میں کانا پھوسی کرتے ہیں جبکہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔

۴۸۔ دیکھ! یہ تجھ پر کیسی پھبتیاں کستے ہیں اور اسی بناء پر یہ گمراہ ہوگئے ہیں اور یہ (حق کا) راستہ پا ہی نہیں سکتے۔

شان نزول

مجمع البیان میں طبرسی نے، تفسیر کبیر میں فخر الدین رازی نے اور بعض دیگر مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی شان نزول کے بارے میں کہا ہے کہ ان میں سے پہلی آیت مشرکین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب رات کے وقت آپ قرآن کی تلاوت کرتے اور خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھتے تو یہ لوگ آپ کو اذیت پہنچاتے۔ آپ کو پتھر مارتے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے سے روکتے۔

خدا تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے ایسا کیا کہ وہ آپ کو اذیت نہ دے سکیں (اور شاید یہ اس طرح سے تھا کہ ان کے دلوں میں آپ کا رعب ڈال دیا تھا)۔ [۷]

ایک اور روایت میں ہے کہ جس وقت رسول اللہ قرآن پڑھتے تو مشرکین میں سے دو آدمی دائیں طرف اور دو آدمی بائیں طرف کھڑے ہوجاتے۔ تالیاں بجاتے، سیٹیاں بجاتے اور بلند آواز سے شعر پڑھتے تاکہ آپ کی آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچے۔ (۸)

ابن عباس کہتے ہیں کہ کبھی کبھار ابوسفیان اور ابوجہل، رسول اللہ کے پاس آتے اور آپ کی باتیں سنتے۔ ایک دن ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: مجھے سمجھ نہیں آتا کہ محمد کیا کہتا ہے؟ صرف یہ نظر آتا ہے کہ اس کے لب ہلتے ہیں۔

ابو سفیان نے کہا: میں سوچتا ہوں کہ اس کی بعض باتیں حق ہیں۔

ابوجہل نے اظہار کیا: وہ دیوانہ ہے۔

ابو لہب نے مزید کہا: وہ کاہن ہے۔

ایک اور نے کہا: وہ شاعر ہے۔

ان غیر موزوں اور ناروا باتوں اور تہمتوں کے بعد مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ (۹)

۱۔ نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸۔

۲۔ نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸۔

۳۔ نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸۔

۴۔ تفسیر المیزان، بحوالہ حلیۃ الاولیاء از ابونعیم اصفہانی۔

۵۔ تفسیر المیزان، بحوالہ حلیۃ الاولیاء از ابونعیم اصفہانی۔

۶۔ تفسیر المیزان، بحوالہ کافی ۴۔

۷۔ مجمع البیان۔

۸۔ تفسیر کبیر، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۹۔ تفسیر کبیر، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

جاہل مغرور

گزشتہ آیات کے بعد بہت سے لوگوں کے سامنے یہ سوال ابھرتا ہے کہ مسئلہ توحید اس قدر واضح ہے کہ تمام موجودات عالم اس کی گواہی دیتے ہیں تو پھر مشرکین اس حقیقت کو کیوں قبول نہیں کرتے، وہ یہ گویا اور رسا آیات قرآن سننے کے باوجود بیدار کیوں نہیں ہوتے؟

ہوسکتا ہے زیرِ بحث آیات اس سوال کے جواب کی طرف اشارہ ہوں۔ پہلی آیت کہتی ہے: اے رسول! "جس وقت تو قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان پردہ حائل کردیتے ہیں" ﴿وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَايُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا﴾۔

یہ حجاب دراصل ہٹ دھرمی، تعصب، خودپرستی، غرور و تکبر اور جہالت ہی تھی کہ جو ان کی فکر و نظر سے حقائق قرآن چھپادیتی تھی اور انہیں اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ توحید و معاد، دعوتِ پیغمبر کی صداقت اور اس قسم کے دیگر حقائق کا ادراک کرسکیں۔

لفظ "مستور" یہاں "حجاب" کی صفت یا ذاتِ پیغمبر کی حقائقِ قرآن کی، اس بارے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان آیات کی تفسیر کے آخر میں بحث کریں گے۔ اسی طرح خدا کی طرف سے اس حجاب کے پیدا ہونے کی کیفیت کے بارے میں بھی وہیں پر بحث آئے گی۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: "ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی اور بوجھ ہے" ﴿وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا﴾۔ اسی لیے جب تو اپنے پروردگار کو قرآن میں تنہا یاد کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں ﴿وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا﴾۔

واقعاً حق سے فرار کیسی عجیب بات ہے یعنی سعادت و نجات سے فرار، خوش بختی اور کامیابی سے فرار اور فہم و شعور سے فرار۔ اس معنی کی نظیر سورہ مدثر کی آیات ۵۰ اور ۵۱ میں بھی ہے:

﴿كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾۔

"گویا وہ خوفزدہ گدھے ہیں کہ غضبناک شیر سے بھاگ رہے ہیں"۔

مزید فرمایا گیا: ہم جانتے ہیں کہ وہ کیوں تمہاری باتیں کان دھر کر سنتے ہیں ﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ﴾ ۔ اور جب وہ آپس میں سرگوشیاں اور کان پھونسیاں کرتے ہیں ﴿وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ﴾ ۔

جس وقت ظالم لوگ مومنین سے کہتے ہیں ہیں کہ صرف تم ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو جو سحر زدہ ہے اور ساحروں نے جس کی عقل و ہوش کو ختم کردیا ہے ﴿إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلاَّ رَجُلًا مَسْحُورًا﴾ ۔

یہ لوگ در اصل ادراک حقیقت کے لیے تیرے پاس نہیں آتے اور تیری باتیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ آکر مخل ہوں اور اگر ہوسکے تو مومنین کو راستے سے بھٹکا دیں ۔ اصولی طور پر جس کے دل پر پردہ پڑا ہو اور جس کے کان ایسے بوجھل ہوں کہ وہ حق بات سن ہی نہ سکے وہ مردان حق کی باتیں ایسے مقاصد کے علاوہ نہیں سنتے ۔

زیر بحث آخری آیت میں پیغمبر اکرم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے مختصر سی عبارت میں ان گمراہوں کو دندان شکن جواب دیا گیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے: دیکھ! تیرے بارے میں کیسی کیسی پھبتیاں کستے ہیں (کوئی تجھے جادو گر کہتا ہے، کوئی سحر زدہ، کوئی کاہن اور کوئی مجنون)، یہی وجہ ہے کہ وہ گمراہ ہوئے ہیں اور راہِ حق پانے کی سکت نہیں رکھتے ﴿انظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلاَيَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا﴾ ۔

ایسا نہیں کہ راستہ واضح نہیں ہے اور حق کا چہرہ چھپ گیا ہے بلکہ ان کے پاس چشم بینا نہیں ہے اور وہ بغض و جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی عقل و خرد گنوا بیٹھے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱ ۔ ان آیات کا مجموعی جائزہ:

زیرنظر آیات میں گمراہ لوگوں کی حالت اور شناخت حق کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کا عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ مجموعی طور پر یہ آیات کہتی ہیں کہ حق کی پہنچان میں ان کے لیے تین بڑی رکاوٹیں موجود ہیں، وہ نہ ہوں تو اُن کے لئے حق کا چہرہ دیکھنا آسان ہوجائے ۔

پہلی یہ کہ قرآن رسول اللہ سے کہتا ہے کہ تیرے اور ان کے درمیان ایک حجاب حائل ہے یہ حجاب سوائے بغض، کینے، حسد اور عداوت کے کچھ اور نہیں کہ جو ان کے سینوں میں تیرے لیے موجود ہے ۔ اسی وجہ سے وہ تیری بلند شخصیت کو نہیں دیکھ پاتے اور تیری گفتار و رفتار کی عظمت کو نہیں سمجھ پاتے ۔یہاں تک کہ اچھائیاں بھی انہیں برائیاں معلوم ہوتی ہیں ۔

دوسری یہ کہ وہ رسول اللہ سے کینہ اور حسد ہی نہ رکھتے تھے بلکہ ان کے دلوں پر جہالت اور اندھی تقلید کے پردے بھی پڑے ہوئے تھے یہاں تک کہ وہ کسی شخص سے حق بات سننے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔

تیسری رکاوٹ شناختِ حق میں یہ حائل تھی کہ ان کے آلاتِ شناخت ہی حق قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ مثلاً ان کے کان ہی حق بات سے ایسی نفرت کرتے تھے کہ گویا حق بات کو دفع کرتے تھے اور اس کے سامنے گویا بہرے ہوجاتے تھے جبکہ اس کے برعکس باطل کی باتیں انہیں پسند تھیں۔ باطل ان کے لیے لذت بخش تھا اور ان پر فوری اثر کرتا تھا۔

خصوصاً یہ بات تو تجربے سے ثابت ہوئی ہے کہ جن باتوں کی طرف انسان رغبت نہ رکھتا ہو انہیں مشکل ہی سے سنتا ہے اور جن کی طرف میلان رکھتا ہے انہیں خاص تیزی کے ساتھ سنتا اور سمجھتا ہے گویا اندرونی میلانات بھی انسان کے ظاہری حواس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

ان تین موانع کا نتیجہ یہ تھا کہ:

اولاً: وہ کلمہ حق سننے سے بھاگتے تھے خصوصاً جب اللہ کی وحدانیت کے بارے میں گفتگو ہوتی کہ جو ان کے تمام مشرکانہ عقائد کی بنیاد ہی سے متصادم تھی تو وہ تیزی سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔

ثانیاً: وہ اپنے انحرافی خط کو صحیح ثابت کرنے کے لیے رسول اللہ اور ان کے ارشادات کے بارے میں غلط توجیہیں کرتے تھے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے۔ کوئی ساحر کہتا اور کوئی شاعر، کوئی آپ کو مجنون قرار دیتا اور کوئی دیوانہ۔

تمام دشمنانِ حق کہ جن کے اعمال و صفات رذیلہ ان کے لیے حجاب ہیں، کی یہی حالت ہے۔ اسی مقام پر ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص راہِ حق اور صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہے اور انحراف و گمراہی سے بچنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے اپنی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے۔ دل کو بغض و کینہ اور حسد و عناد سے پاک کرنا چاہیے۔ روح کو غرور و نخوت سے پاک کرنا چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ اپنے وجود کو صفاتِ رذیلہ سے پاک کرنا چاہیے چونکہ جب دل کا آئینہ ان رذائل سے پاک صاف ہوکر صیقل ہوجائے گا تو پھر تمام حقائق اس پر اپنا پَرتَو ڈال سکیں گے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بے علم پاک دل افراد حقائق سمجھ لیتے ہیں لیکن غیر تہذیب یافتہ عالم نہیں سمجھ پاتے۔

۲۔ خدا کی طرف نسبت کا مفہوم:

دوسری بہت سی آیات کی طرح زیر بحث آیات میں بھی حجابوں کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

تیرے اور ان کے درمیان ہم حجاب حائل کردیتے ہیں اور ان کے کانوں میں سنگینی قرار دیتے ہیں۔

ہوسکتا ہے ایسی تعبیرات سے جاہل افراد مکتبِ جبر کا مفہوم لیں حالانکہ یہ تو ان کے اعمال ہی کے آثار اور نتائج ہیں۔ در حقیقت وہ خود ہی ہیں جو اپنے گناہوں اور بری صفات کے ذریعے یہ حجاب پیدا کرتے ہیں لیکن چونکہ ہر چیز کی خاصیت خدا کی طرف سے ہے اور عملِ قبیح اور صفاتِ رذیلہ میں خدا نے یہ تاثیر پیدا کی ہے لہٰذا اس خاصیت اور حجاب کی نسبت خدا کی طرف بھی دی جاسکتی ہے۔ اس بارے میں گزشتہ مباحث میں ہم بارہا گفتگو کرچکے ہیں اور اِس سلسلے میں قرآن سے بھی بہت سے شواہد پیش کیے جا چکے ہیں۔

۳۔ حجاب مستور کیا ہے؟:

اس سلسلے میں مفسرین کی کئی مختلف آراء ہیں۔ مثلاً:

(الف) بعض "مستور" کو "حجاب" کی صفت سمجھتے ہیں کہ قرآن کی تعبیر کا ظہور یہ ہے کہ حجاب نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ در حقیقت کینہ و عداوت اور حسد و بغض کے حجاب ایسے نہیں ہیں جو آنکھ سے دکھائی دیں بلکہ ان کے باعث جس سے حسد اور کینہ ہوتا ہے اُس کے اور اِس کے درمیان ایک ضخیم پردہ حائل ہوجاتا ہے۔

(ب) بعض دیگر مفسرین "مستور" کو "ساتر" کے معنی میں سمجھتے ہیں (کیونکہ اسم مفعول بعض اوقات فاعل کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ آیات مذکورہ میں بھی بعض مفسرین "مسحور" کو "ساحر" کے معنی میں سمجھتے ہیں)۔ [۱]

(ج) بعض "مستور" کو "حجاب" کی مجازی توصیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مراد یہ نہیں ہے کہ یہ حجاب مستور ہے بلکہ وہ حقائق جو اس حجاب کے ماوراء ہیں وہ مستور ہیں (مثلاً پیغمبر اکرم کی شخصیت آپ کی دعوت کی عظمت اور آپ کے ارشادات کی عظمت)۔

لیکن ان تینوں تفسیروں میں غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر ظاہر آیت سے زیادہ ہم آہنگ ہے، بعض روایات میں بھی ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سخت ترین دشمن آپ کی طرف آتے جبکہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ قرآنِ مجید کی تلاوت میں مشغول ہوتے لیکن وہ آپ کو نہ دیکھ پاتے گویا آپ کی خیرہ کن

عظمت کے باعث یہ دل کے اندھے آپ کو نہ دیکھ پاتے اور نہ پہچان پاتے لہٰذا آپ ان کی طرف سے اذیت سے محفوظ رہتے ۔

۱۔ اخفش سے منقول ہے کہ وہ کہتا ہے: "اسم مفعول کبھی اسم فاعل کے معنی میں ہوتا ہے مثلاً "میمون" "یامن" کے معنی میں اور "مشئوم" "شائم" کے معنی میں ۔

۴۔ "اکنہ" اور "وقر" کیا چیز ہے؟

"اکنہ" "کنان" (بروزن "زیان") کی جمع ہے، یہ دراصل ہر قسم کی ڈھانپتے اور مستور کرتے ہیں لیکن "کن" (بروزن "جِنّ") اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ "کن" کی جمع "اکنان" ہے۔ بعد ازاں اس معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر چیز کہ جو مستور ہونے کا باعث بنے کے لئے بولا جانے لگا، مثلاً پردہ، گھر اور وہ اجسام کہ جن کے پیچھے انسان اپنے آپ کو چھپائے۔

"وقر" (بروزن "جبر") سنگینی کے معنی میں ہے کہ جو کان میں پیدا ہوجائے اور "وِقر" (بروزن "رزق") بارِ سنگین کے معنی میں ہے۔

۵۔ "﴿ما يستمعون به﴾" کی تفسیر

اس کی مفسرین نے دو تفسیر کی ہیں:

طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر الداین رازی نے تفسیر کبیر میں اور بعض دیگر مفسّرین نے اسے "سببِ استماع" کے معنی میں لیا ہے یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ تیری باتیں کیوں کان لگا رسنتے ہیں، ادراکِ حق کے لئے؟ نہیں بلکہ استہزاء اور جوڑ توڑ لگانے اور الٹی سیدھی توجیہات کرنے کے لئے مختصر یہ کہ گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کے لئے علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور بعض دیگر مفسّرین نے اسے "وسیلہ استماع" کے معنی میں لیا ہے یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ کن کانوں سے تیری باتیں کان لگا رسنتے ہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی سرگوشیوں سے آگاہ ہیں۔

(پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے)۔

۶۔ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "مسحور" کیوں کہتے تھے؟

"مسحور" کا معنی ہے سحر شدہ اور "ساحر" کا معنی ہے سحر کرنے والا۔

دشمن رسول للہ کو "مسحور" یا تو اس بناء پر کہتے تھے کہ وہ اس طرح آپ کی طرف جنون کی نسبت دینا چاہتے تھے اور کہنا چاہتے تھے کہ جادوگروں نے آپ کو فکر و عقل پر اثر کیا ہے اور ساحروں نے (معاذ اللہ) آپ کے حواس مختل کردیئے ہیں۔

بعض مفسّرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "مسحور" یہاں "ساحر" کے معنی میں ہے (کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اسم مفعول کبھی اسمِ فاعل کے معنی میں آتا ہے) ۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ رسول اللہ کا غیر معمولی کلام جادو ہے جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے ۔ ضمنی طور پر یہ بات کہہ کر وہ آپ کے کلام کی عجیب تاثیر کا اعتراف کرتے تھے ۔

۷۔ توحید کی آواز پر مشرکین کا خوف

زیرِ بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے مشرکین خاص طور پر توحید کی آواز سن کر سخت خوف میں مبتلا ہوجاتے تھے اور بھاگ کھڑے ہوتے تھے کیونکہ ان کی تمام تر زندگی کی بنیاد شرک اور بت پرستی تھی اور ان کے معاشرے پر مشرکانہ نظام حکمران تھا ۔ اگر توحید کی بنیاد پڑجاتی تو نہ صرف ان کے مذہبی عقائد پر ضرب پڑتی تھی بلکہ ان کا معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور تمدنی نظام بھی جو شرک پر مبنی تھا وہ تباہ ہوکر رہ جاتا، اس طرح حکومت پسے ہوئے مستضعف لوگوں کے ہاتھ آجاتی۔

مستکبرین کا خاتمہ ہوجاتا، اور استعمار اور لوٹ کھسوٹ کہ جو مشرکانہ نظاموں کا نتیجہ ہے ختم ہوجاتا، اور طبقاتی تفاوت ختم ہوجاتا تھا، لہٰذا جن کے اقتدار کا انحصار شرک پر تھا ان کی سخت کوشش تھی کہ توحید کی پکار کسی کے کان تک نہ پہنچنے پائے لیکن جیسا کہ زیرِ بحث آیات اشارہ کرتی ہیں وہ ظالم اور ستمگر لوگ تھے کہ جو مستضعف عوام پر بھی ظلم کرتے تھے اور اپنے آپ پر بھی، کیونکہ ہر ظالم منحرف اپنی قبر آپ کھودتا ہے ۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ مشرکین چاہتے تھے کہ انھیں فسق و فجور اور گناہ جاری رکھنے کا کوئی جواز ہاتھ آجائے لہٰذا باربار پوچھتے تھے قیامت کا دن کب آئے گا:﴿بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ، يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ﴾

"بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ بُرائی کرتا رہے ۔ (جبھی تو) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا"۔ (قیامت/۵،۶)

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بھی ذمہ داری اور جوابدہی سے فرار کے لئے ایک بہانہ سازی تھی۔

آیات ۴۹،۵۰،۵۱،۵۲

۴۹﴿وَقَالُوا أَئِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا﴾

۵۰﴿قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا﴾

۵۱﴿أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا﴾

۵۲﴿يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا﴾

ترجمہ

۴۹۔ اور انھوں نے کہا کہ بوسیدہ ہڈیاں ہوجائیں گے اور بکھر جائیں گے تو دوبارہ نئی خلقت حاصل کریں گے۔

۵۰۔ کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا ہوجاؤ۔

۵۱۔ یا جو مخلوق تمھاری نظر میں ان سے زیادہ سخت ہو (اور جس میں زندگی کے دُور دُور تک کوئی آثار نہ ہوں۔ پھر بھی خدا قادر ہے کہ تمھیں نئی زندگی کی طرف پلٹادے)۔ عنقریب وہ کہیں گے کون ہمیں دوبراہ پلٹائے گا۔ کہہ دو: وہی جس نے تمھیں پیدا کیا تھا۔ وہ (تعجب اور انکار سے) تیرے سامنے اپنے سر جھکاتے ہیں اور کہتے ہیں: ایسا کس وقت ہوگا۔ کہہ دو: شاید نزدیک ہو۔

۵۲۔ وہی دن کہ جب وہ تمھیں (تمھاری قبروں سے) بُلائے گا تم بھی جواب دو گے اس حالت میں کہ اُس کی حمد کررہے ہوگے اور خیال کروگے کہ تم تھوڑی سی مدت ہی (عالمِ برزخ میں) رہے ہو۔

قیامت یقینی ہے

گزشتہ آیات توحید سے متعلق اور شرک کے خلاف مبارزہ کے بارے میں تھیں لیکن زیرِنظر آیات میں معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو ہے اور ہر مقام پر اس گفتگو سے مسئلہ توحید کی تکمیل ہوتی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ عقائدِ اسلامی میں سے بنیادی ترین مبداء ومعاد کا عقیدہ ہےیہی عقیدہ انسان کی عملی اور اخلاقی طور پر تربیت کرتا ہے، یہ عقیدہ آلودگی اور گناہ سے بچاتا اور ادائیگی فرض کی دعوت دیتا ہے اور انسان کو تکامل وارتقاء کے راستے پر جاتا ہے۔

ان آیات میں منکرین معاد کے تین سوالات یا تین اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، پہلے ارشاد ہوتا ہے: انھوں نے کہا کہ جب ہم ہڈیوں میں تبدیل ہوگئے اور یہ ہڈیاں بھی بوسیدہ ہوکر منتشر ہوگئیں تو کیا ہمیں نئے سرے سے تخلیق کیا جائے گا ﴿وَقَالُوا أَئِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا﴾ ۔[۱]

کیا اصولی طور پر اس بات کا امکان ہے کہ بوسیدہ اور ذرہ ذرہ ہوکر بکھر جانے والی ہڈیاں نئے سے جمع ہوں اور اس کے بعد پھر انھیں لباسِ حیات عطا ہوجائے، بوسیدہ اور پراکندہ ہڈیاں کہاں اور ایک زندہ طاقتور اور عقلمند انسان کہاں ۔

معاد کے بارے میں قرآن کی دیگر بہت سی تعبیرات کی طرح یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ اپنی گفتگو میں ہمیشہ معادِ جسمانی کی بات کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بکھر جانے کے بعد یہ جسم پھر پلٹ آئے گا، ورنہ اگر معادِ روحانی کی بات ہوتی تو مخالفین کے ایسے اعتراضات کے کوئی معنی نہ تھے ۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: کہہ دو: کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈی سے لباسِ حیات عطا کرنا تو آسان کام ہے ”تم پتھر یا لوہا بن جاؤ“ تو پھر بھی خدا قادر ہے کہ تمھارے بدن کو لباسِ حیات پہنادے ﴿قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا﴾ ۔

یہاں تک کہ اگر کوئی مخلوق پتھر اور لوہے سے بھی سخت تر ہو اور زندگی سے بہت دُور ہو اور اس لحاظ سے تمھاری نظر میں زیادہ بڑا کام ہو تو خدا قادر ہے کہ اس کے بدن پر جامہ حیات پہنادے ﴿أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ﴾ ۔

واضح رہے کہ ہڈیاں بوسیدہ ہوکر خاک ہوجاتی ہیں اور مٹی میں ہمیشہ آثارِ حیات ہوتے ہیں، نباتات خاک ہی سے اُگتے ہیں، زندہ موجودات خاک ہی میں پرورش پاتے ہیں اور انسانی وجود کی اصل بھی خاک ہے، مختصر یہ کہ خاک زندگی کا دروازہ ہے لیکن پتھر، لوہا یا وہ موجودات جو ان سے زیادہ سخت ہیں ان کا فاصلہ زندگی سے بہت زیادہ ہے، نباتات کبھی بھی ہو اور جو کچھ بھی ہوجاؤ تمھاری طرف زندگی لوٹادینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں ۔

پتھر بوسیدہ ہوکر خاک میں بدل جاتے ہیں اور پھر مٹھی کے سینے سے زندگی پیدا ہوجاتی ہے، لوہا بھی بوسیدہ ہوکر پراکندہ ہوجاتا ہے اور پھر اس کرہ خاکی کے دوسرے موجودات سے مل کر تمام مبداء حیات بن جاتا ہے ۔

اس زمین میں ہم جس موعود کا بھی تصور کریں، وہ معدنیات میں سے ہو یا معدنیات سے مشابہ کسی چیز سے، انسانی بدن کی عمارت میں ساعمتال ہوتا ہے، یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ اس عالم کے تمام ذرّات میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ موجودِ زندہ میں تبدیل ہوجائے اگرچہ ان میں سے بعض کسی مرحلے میں زندگی سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مثلاً مٹی اور بعض نسبتاً دور ہوتے ہیں مثلاً پتھر اور لوہا ۔

ان کا اعتراض یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اچھا اگر ہم مان لیں کہ یہ بوسیدہ اور منتشرہڈیاں پھر زندگی حاصل کر سکتی ہیں تو یہ کام انجام دینے کی قدرت کسی میں ہے؟ وہ یہ اس لئے کہتے تھے کیونکہ وہ اس تبدیلی کو ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل امر سمجھتے تھے۔ "وہ کہتے تھے کہ کون انھیں اٹھائے گا" ﴿فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا﴾۔

اس سوال کا جواب قرآن اس طرح دیتا ہے: ان سے کہو کہ وہی جس نے پہلی مرتبہ تمھیں پیدا کیا تھا ﴿قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾۔

اگر "وہ قابل" کی قابلیت میں تمھیں شک ہے تو سوچو کہ تم پہلے بھی تو خاک تھے، پھر اب کیا رکاوٹ ہے پھر خاک بننے کے بعد تمھیں زندگی دے دی جائے، اگر "فاعل" کی فاعلیت میں شک ہے تو وہی خدا جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا وہ پھر بھی یہ کام کر سکتا ہے کیونکہ: حكم الامثال فيما يجوز وفيما لايجوز واحد-

ہم مثل چیزوں کے جائز اور ناجائز فیصلہ ایک جیسا ہوتا ہے۔

آخر میں ان کا تیسرا اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تعجب اور انکار کرتے ہوئے اپنا سرہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قیامت کب برپا ہوگی ﴿فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ﴾۔

"﴿فَسَيُنْغِضُونَ﴾" "انغاض" کے مادہ سے کسی مقابل شخص کی جانب تعجب سے سر ہلانے کے معنی میں ہے۔

اس اعتراض سے ان کی مراد یہ تھی کہ فرض کریں یہ مادہ خاکی انسان میں تبدیل ہونے کے مقابل ہے اور یہ بھی مان لیں کہ خدا میں یہ قدرت ہے لیکن یہ تو ایک ادھار والے وعدے سے زیادہ بات نہیں ہے اور معلوم نہیں کہ قیامت کب واقع ہوگی، اگر ہزاروں یا لاکھوں سال بعد ہوتی تو ہماری آج کی زندگی میں اس کا کیا اثر ہوگا، نقد بات کرو ادھار بات چھوڑو۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: ان سے کہہ دو: اس کا زمانہ قریب ہے ﴿قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا﴾۔

قیامت کی گھڑی قریب ہی ہے کیونکہ اس عالم کی مجموعی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو دوسرے جہاں کی بے پایاں زندگی کے مقابلے میں تو جلدی گزر جانے والے ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر اگر قیامت ہمارے چھوٹے اور محدود معیار کے مطابق دور بھی ہو تو بھی قیامت کا آستانہ۔ یعنی موت۔ ہم سب کے قریب ہے۔ کیونکہ موت قیامت صغریٰ ہے: "اذا مات الانسان قامت قيامته"

جب انسان کو موت آجاتی ہے تو اس کے لیے قیامت واقع ہوجاتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موت قیامت کبریٰ نہیں ہے لیکن اس کی یاد تو دلاتی ہے۔

ضمنی طور پر "عَسیٰ" کی تعبیر شاید اس طرف اشارہ ہو کہ کوئی شخص دقیقاً قیامت کی تاریخ نہیں جانتا اور یہ ان علوم میں سے ہے جو ذاتِ پروردگار سے مخصوص ہیں ۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں ۔

اگلی آیت میں قیامت کی متعین تاریخ ذکر کیے بغیر اس خصوصیات بیان کی گئی ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے: زندگی کی طرف یہ بازگشت اس دن ہوگی جس دن تمہیں قبروں سے پکارا جائے گا اور تم چاہو یا نہ چاہو اس کی دعوت پر لبیک کہو گے اور خدا کی حمد و ثناء کرتے ہوئے زندگی کی طرف پلٹ آؤ گے

﴿يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ﴾۔

اور وہ ایسا دن ہے کہ تم موت اور قیامت کے درمیان کے فاصلہ(دور برزخ) کو کم سمجھو گے اور خیال کرو گے کہ برزخ میں تو تم تھوڑی سی مدت ہی رہے ہو

﴿وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلاَّ قَلِيلًا﴾ ۔ اگرچہ یہ طولانی ہو لیکن عالم بقاء کی انتہا عمر کے مقابلے میں چند جلدی سے گزر جانے والے لمحات سے زیادہ نہیں ہے ۔

بعض مفسّرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ دنیا ل میں توقف کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ دن کہ جب تم جان لوگ کہ دنیاوی زندگی کوئی زیادہ طولانی نہ تھی چند مختصر سی گزر گھڑیاں تھیں ۔

---

۱ ۔ رفاف، بروزن کرات۔

آیات ۵۳،۵۴،۵۵،۵۶،۵۷

۵۳﴿وَقُلْ لِعِبَادِی یَقُولُوا الَّتِی هِیَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّیْطَانَ یَنزَغُ بَیْنَهُمْ إِنَّ الشَّیْطَانَ کَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُبِینًا﴾

۵۴﴿رَبُّکُمْ أَعْلَمُ بِکُمْ إِنْ یَشَأْ یَرْحَمْکُمْ أَوْ إِنْ یَشَأْ یُعَذِّبْکُمْ وَمَا أَرْسَلْنَاکَ عَلَیْهِمْ وَکِیلًا﴾

۵۵﴿وَرَبُّکَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیِّینَ عَلیٰ بَعْضٍ وَآتَیْنَا دَاوُودَ زَبُورًا﴾

۵۶﴿قُلْ ادْعُوا الَّذِینَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلاَیَمْلِکُونَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنکُمْ وَلاَتَحْوِیلًا﴾

۵۷﴿أُوْلٰئِکَ الَّذِینَ یَدْعُونَ یَبْتَغُونَ إِلیٰ رَبِّهِمْ الْوَسِیلَةَ أَیُّهُمْ أَقْرَبُ وَیَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَیَخَافُونَ عَذَابَهُ إِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ
مَحْذُورًا﴾

ترجمہ

۵۳۔ میرے بندوں سے کہدو: ایسی بات کریں کہ جو زیادہ اچھی ہو کیونکہ شیطان (ناموزوں باتوں کے ذریعے) ان کے درمیان فتنہ وفساد کھڑا کردیتا ہے ۔ شیطان ہمیشہ انسان کا کھلا ہوا دشمن۔

۵۴۔ تمھارا پروردگار (تمھاری نیتّوں اور اعمال کو) تم سے زیادہ جانتا ہے اگر وہ چاہے (اور تمھیں اس لائق سمجھے) تو اپنی رحمت تمھارے شاملِ حال کردے اور اگر چاہے تو عذاب اور ہم نے تجھے ان پر وکیل نہیں بنایا (کہ تیرے لئے لازم ہو کہ جبراً ایمان لے آئیں)۔

۵۵۔ وہ تمام لوگ کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ان کے حالات سے تیرا پروردگار زیادہ آگاہ ہے (اور اگر ہم نے تجھے دوسرے نبیوں پر فضیلت عطا کی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ہے۔

۵۶۔ ان سے کہہ دو: تم نے خدا کے علاوہ جو (اپنے معبود) بنا رکھے ہیں انھیں پکار کر دیکھو، وہ تمھاری کوئی مشکل حل نہیں کرسکتے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی لاسکتے ہیں۔

۵۷۔ وہ تو وہ ہیں جو خود اپنے پروردگار سے (تقرّب کا) وسیلہ طلب کرتے ہیں، ایسا وسیلہ جو زیادہ قریب ہو اور یہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ سب تیرے پروردگار کے عذاب سے بچنے کی فکر میں اور وحشت زدہ ہیں۔

تمام مخلفین سے منطقی طرزِ عمل

گزشتہ آیات میں مبداء و معاد کے بارے میں گفتگو تھی اور دو اہم عقائد کے بارے میں دلائل پیش کئے گئے تھے، زیرِ بحث آیات میں مخالفین خصوصاً مخالفین مشرکین کے ساتھ گفتگو اور استدلال کے آداب سکھائے گئے ہیں کیونکہ مکتب جتنا عالی ہو اور منطق جتنی قوی ہو اگر بحث و گفتگو صحیح طریقے اور لطف و محبت کی بجائے خشونت و سختی پر بنی ہوگی تو بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔

لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: میرے بندوں سے کہہ دو کی ایسی گفتگو صحیح کریں جو بہت اچھی ہو ﴿وَقُلْ لِعِبَادِی يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾۔ ان کی گفتگو مضمون کے لحاظ سے، طرزِ بیان کے لحاظ سے، اخلاق کے حوالےں سے، انسانی آداب کے حوالے سے سے بہترین ہو۔

کیونکہ اگر انھوں نے "قولِ احسن" کو ترک کردیا اور کلام میں خشونت، سختی اور ہٹ دھرمی ہوئی تو شیطان ان کے درمیان فتنہ و فساد اٹھادے گا ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ﴾۔

اور یہ بات کبھی فراموش نہ کرو کہ شیطان کمین لگائے بیٹھا ہے اور چین سے نہیں بیٹھا "کیونکہ شیطان شروع ہی سے نوعِ انسان کا کھلا دشمن ہے" ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُبِينًا﴾۔

اس آیت میں لفظ "عباد" سے کون لوگ مراد ہیں اس سلسلے میں مفسّرین میں دو مختلف نظریے ہیں۔ بعض قرائن سے ان میں سے ہر ایک کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ "عباد" مراد مشرک بندے ہیں اگرچہ انھوں نے غلط راہ اختیار کررکھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی جذبات کی تحریک کے لئے انھیں "عبادی" (میرے بندے) سے یاد کیا ہے اور انھیں دعوت دی ہے کہ وہ "احسن" یعنی توحید اور نفی شرک کا راستہ اختیار کریں اور شیطانی وسوسوں سے خبردار رہیں۔ گویا ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ توحید و معاد کے دلائل پیش کرنے کے بعد مشرکین کے دلوں کو اپیل کی جائے تاکہ ان میں سے جو تھوڑی بہت آمادگی رکھتے ہیں وہ بیدار ہوجائیں اور راہِ راست پر آجائیں۔

یہ سورہ مکّی ہے اور اس وقت ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور اس صورت میں منطق و استدلال کے علاوہ ان سے مقابلے کا اور کوئی راستہ نہ تھا اس حوالے سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ لفظ "عبادی" مومنین کی طرف اشارہ ہے اور انہیں دشمنوں سے بحث کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات نو وارد مومنین اپنے پہلے والے طرز عمل ہی کا مظاہرہ کرتے، اپنے عقیدے کے ہر مخالف سے

سخت رویہ اختیار کرتے، انہیں صراحت سے اہلِ جہنم، اہلِ عذاب، بدبخت اور گمراہ کہتے پھرتے اور اپنے تئیں اہل نجات قرار دیتے ۔ اس سے رسول اللہ کی دعوت کے بارے میں مخالفین میں ایک منفی ردّ عمل جنم لیتا ۔

اس سے قطع نظر بعض اوقات مخالفین رسول اللہ کے بارے میں جو توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے اس پر بھی مومنین بے اختیار ہوکر انہیں سخت سست کہتے تھے ۔ جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے ۔ مخالفین رسول اللہ کے لیے مسحور، مجنون، کاہن اور شاعر جیسے الفاظ کہتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بعض مومنین بھی ان سے جھگڑ پڑتے اور جو منہ میں آتا کہہ ڈالتے ۔ قرآن مومنین کو اس طرز عمل سے روکتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ نرمی و لطافت سے جواب دیں اور بحث و گفتگو میں بہترین الفاظ استعمال کریں تاکہ شیطانی نقصان سے بچ جائیں ۔

اس تفسیر کے مطابق لفظ "بینھم" (ان کے درمیان) کا مفہوم یہ ہوگا کہ شیطان کوشش کرتا ہے کہ مومنین اور مخالفین کے درمیان فتنہ و فساد پیدا کردے یا کوشش کرتا ہے کہ مومنین میں غیر محسوس طور پر نفوذ کرے اور انہیں فتنہ و فساد پر ابھارے ۔ کیونکہ "ینزغ" "نزغ" کے مادہ سے فساد کروانے کی نیّت سے کسی کام میں مداخلت کرنے کے معنی میں ہے ۔

لیکن تمام قرائن کو ملحوظِ نظر رکھا جائے تو دوسری تفسیر ظاہر آیت سے زیادہ میل کھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر لفظ "عبادی" قرآن میں مومنین کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

علاوہ ازیں بعض مفسرین نے اس آیت کی جو شانِ نزول نقل کی ہے اس میں ہے کہ مکّہ میں مشرکین اصحاب رسول کو اذیت دیتے تھے تو گاہے دل تنگی کے عالم میں اصحاب رسول اللہ سے اصرار کرتے تھے کہ ہمیں جہاد کی اجازت دی جائے (یا پھر گفتگو میں سخت کلامی اور جیسا سوال ویسا جواب کی اجازت دی جائے) اس پر رسول خدا فرماتے تھے کہ ابھی تک مجھے ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا ۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں حکم دیا گیا کہ صرف منطقی گفتگو سے جواب دینے کا اسلوب جاری رکھیں ۔ [1]

بعد والی آیت مزید کہتی ہے: تمہارا پروردگار تمہارے حالات سے زیادہ آگاہ ہے ۔ اگر وہ چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کردے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے ﴿رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ إِنْ يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِنْ يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ﴾ ۔

پہلی آیت کی دو تفسیروں کے پیش نظر اس آیت کی بھی دو تفسیریں ممکن ہیں :

پہلی یہ کہ اے مشرکین اور اے تہی از ایمان لوگو! تمہارا خدا وسیع رحمت بھی رکھتا ہے اور دردناک عذاب بھی۔ تمہیں وہ جس لائق سمجھے گا وہ سلوک کرے گا۔ کیا ہی بہتر ہے کہ تم اس وسیع رحمت کے سائے میں آجاؤ اور اس کے عذاب سے بچو۔

دوسری یہ کہ اے اہلِ ایمان! یہ گمان نہ کرو بس تمہی اہلِ نجات ہو اور دوسرے سب اہلِ جہنم ہیں۔ خدا تمہارے اعمال اور قلوب سے زیادہ آگاہ اور باخبر ہے اگر چاہے تو تمہارے گناہوں کے سبب تمہیں عذاب دے اور چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کردے۔ اپنی حالت پر کچھ غور و فکر کرو اور اپنے اور دوسروں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔

بہر حال آیت کے آخر میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے۔ آپ کی دلجوئی کی گئی ہے اور مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپ کے انتہائی رنج کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے ان پر وکیل نہیں بنایا کہ تم یہ سمجھو کہ انہیں لازمی طور پر ایمان لانا چاہیے ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاکَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا﴾۔ تیری ذمہ داری تو یہ ہے کہ نہیں کھلے بندوں حق کی طرف دعوت دو اور اپنی جد و جہد جاری رکھو۔ اگر وہ ایمان لے آئیں تو بہت خوب ورنہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تُو نے تو اپنا فریضہ ادا کردیا۔

اس جملے میں مخاطب اگرچہ رسول اللہ کی ذات ہے لیکن بعید نہیں کہ قرآن کے ایسے دیگر بہت سے مقامات کی طرح مراد تمام مومنین ہوں۔ یہ بات دوسری تفسیر کی تائید میں ایک اور قرینہ ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ تم مسلمانوں کی ذمہ داری حق کی طرف دعوت دینا ہے چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں لہٰذا گفتگو میں سختی اور توہین و ہتک کا طریقہ اختیار کرنے اور اس طرح حد سے زیادہ جوش و خروش دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اگلی آیت اس سے بھی بڑھ کر بات کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا تمہارے ہی حالات سے آگاہ نہیں بلکہ "تیرا پروردگار آسمان اور زمین کے سب باسیوں کی نسبت زیادہ آگاہ ہے اور زیادہ علم رکھتا ہے" ﴿وَرَبُّکَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے بعض نبیوں پر فضیلت بخشی ہے اور داؤد کو زبور عطا کی ہے ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا﴾۔

یہ جملہ در حقیقت مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب ہے ۔ وہ نہایت تحقیر انداز میں کہتے تھے کہ کیا خدا کے پاس اور کوئی شخص نہ تھا کہ اس نے ایک یتیم محمد کو نبوت کے لیے انتخاب کیا اور اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اسے تمام انبیاء کا سردار اور خاتم النبیین قرار دے دے ۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ۔ خدا ہر شخص کے انسانی مقام اور قدر و یمت سے آگاہ ہے اور انہی عام لوگوں میں سے اپنے انبیاء کو منتخب کرتا ہے اور اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ۔ کسی کو خلیل کے اعزاز سے نوازا، کسی کو کلیم اللہ کا مقام عطا کیا کسی کو ”روح اللہ“ قرار دیا اور پیغمبر اسلام کو ”حبیب اللہ“ کی حیثیت سے چن لیا ۔ خلاصہ یہ کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور یہ فضیلت اس نے ان معیاروں کے مطابق عطا کی ہے جنہیں وہ خود جانتا ہے اور جو اس کی حکمت کے مطابق ہیں ۔

رہا یہ سوال کہ سب انبیاء میں سے یہاں صرف حصرت داؤد(ص) کو زبور عطا کرنے کی بات کیوں کی گئی ہے، ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ پہلو ہوں :

۱۔ کتبِ انبیاء میں حضرت داؤدکی زبور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ تمام ترمناجات، دعاؤں اورپند و نصیحت پر مشتمل ہے اور تمام تر ”قول احسن“ اور اچھی گفتگو کا نمونہ ہے کہ جس کا حکم پہلی آیات میں دیا گیا ہے ۔ یہ کتاب اس حکم سے سب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے ۔

۲۔ زبورِ داؤد میں صالحین اونیک بندوں کی حکومت کی خبردی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ وہ لوگ ظاہراً تہی دست، فقرا اور یتیم ہوں ہوگے ۔ (۲)

”--- کیونکہ شریر منطق ہوجائیں گے لیکن اللہ پر توکل کرنے والے زمین کے وارث ہوں گے ۔ہاں ایک عرصے بعد ثرید یاقی نہ رہے گا تو اس کے بارے میں سوچ بچا کرے گا اور وہ نہیں ہوگا لیکن اہلِ حکمت (صالحین) زمین کے وارث ہوں گے ۔“

اسی مزمور کے بائسویں اور انتیسویں جملے میں اس سے بالکل مشابہ تعبیرات موجودہیں ۔ یہی بات قرآن مجید کی سورہ انبیاء کی آیہ ۱۰۵ میں ہے:﴿ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکران الارض یرثھا عبادی الصالحون﴾

ہم نے زبور میں یہ بات رقم کی ہے کہ کچھ عرصے بعد ہمارے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے ۔

اور یہ بات رسول اللہ اور سچے مومنین کی دعوت سے بالکل ہم آہنگ ہے کہ جو بہت تہی دست تھے اور یہ مشرکین کے اعتراض کا جواب ہے۔

۳۔ حضرت داؤد علیہ السلام اگرچہ وسیع حکومت کے مالک تھے لیکن خدا تعالیٰ اس بات کو ان کے لیے اعزاز و افتخار قرار نہیں دیتا بلکہ کتابِ زبور کو ان کے لیے اعزاز شمار کرتا ہے تاکہ مشرکین جان لیں کہ ایک انسان کی عظمت کا معیار مال و دولت اور ظاہری اقتدار و حکومت نہیں ہے لہٰذا یتیم اور غریب ہونا تحقیر و تذلیل کی دلیل نہیں ہے۔

۴۔ یہودی کہتے تھے کہ موسیٰ (ص) کے بعد کسی کتاب کا نازل ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس پر قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ جبکہ ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تو تم نزولِ قرآن کے بارے میں کیوں تعجب کرتے ہو (البتہ حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب احکام کی کتاب نہ تھی بلکہ اخلاق کی کتاب تھی لیکن جو کچھ بھی تھی تورات کے بعد اور خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی)۔

بہرحال کوئی مانع نہیں کہ زیرِ بحث آیت میں تمام انبیاء اور تمام کتب میں سے حضرت داؤد (ص) اور زبور کا انتخاب ان مذکورہ چاروں پہلوؤں کی بناء پر ہو۔

بعد والی آیت میں پھر مشرکین کے بارے میں گفتگو ہے۔ گزشتہ مباحث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرم سے فرمایا گیا ہے: ان سے کہو کہ خدا کے علاوہ جن معبودوں کو لائقِ پرستش سمجھتے ہیں انہیں صدا دیں۔ نہ ان کے بس میں یہ ہے کہ وہ تمہاری مشکلات اور مصائب دور کر سکیں اور نہ ہی ان میں کوئی تغیّر و تبدیل پیدا کر سکتے ہیں ﴿قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَايَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَاتَحْوِيلًا﴾۔

در حقیقت یہ آیت قرآن کی دیگر بہت سی آیات کی طرح مشرکین کے عقیدے اور منطق کو اس حوالے سے باطل قرار دیتی ہے کہ معبودوں کی پرستش یا تو حصول مفاد کے لیے ہے یا دفعِ نقصان کے لیے جبکہ ان کے تو بس میں نہیں کہ کسی کی مشکل کو ٹال سکیں یہاں تک کہ وہ تو کسی مشکل میں کوئی تبدیلی بھی پیدا نہیں کر سکتے یعنی اس کی شدت میں کمی بھی نہیں کر سکتے کہ جس سے ان کی کوئی قدرت ظاہر ہو سکے۔ لہٰذا "فلایملکون کشف الضر" کے بعد "ولا تحویلاً" اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ تو مشکلات کی پوری تاثیر برطرف کر سکتے ہیں نہ ان میں تغیّر کر کے کچھ تھوڑی تاثیر کم کر سکتے ہیں۔

"زعمتم" "زعم" کے مادہ اور عام طور پر غلط خیال و تصوّر کو کہا جاتا ہے۔ اسی لیے ابنِ عباس سے منقول ہے کہ جہاں کہیں قرآن میں لفظ "زعم" استعمال ہوا ہے جھوٹ اور کذب (اور بے بنیاد عقیدے) کے معنی میں ہے۔

مفردات میں راغب کہتا ہے:الزعم حکایة قول یکون مظنة للکذب---

زعم نقلِ قول (یا عقیدے) ہے کہ جس میں جھوٹ کا احتمال ہو یہ قرآن میں جن جن مواقع پر استعمال ہوا ہے وہاں مذمت و سرزنش کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

لفظ "کشف"اصل میں کسی چیز سے پردہ، لباس یا ایسی کسی چیز کو ہٹانے کے معنی میں ہے اور یہ جو "کشف الضر' ،غم اندوہ، بیماری یا پریشانی برطرف ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غم و اندوہ، بیماری یا پریشانی انسانی بدن اور روح پر گویا پردے کی طرح آگرتی ہے اور آسائش، آرام اور سکون کہ جو حقیقی چہرہ ہے، اسے چھپا دیتی ہے لہذا غم، دکھ اور پریشانی کے دور ہونے کو "کشف الضر" کہا جاتا ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں "الذین" کی تعبیر یہ بات بیان کرتی ہے کہ مراد اللہ کے علاوہ سب معبود نہیں ہیں بلکہ فرشتے، حضرت عیسی(ص) اور ان جیسے معبود مراد ہیں (کیونکہ "الذین" عام طور پر ذوی العقول کی جمع کے لیے بولا جاتا ہے)۔

بعد والی آیت در حقیقت پہلی آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے لیے دلیل ہے۔ یہ آیت کہتی ہے: جانتے ہو کہ تمہاری مشکلوں کو اذنِ پروردگار کے بغیر ٹالنے پر کیوں قادر نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ تو خود اپنی مشکلات بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خود کوشش کرتے ہیں کہ اس کی پاک ذات کا تقرب حاصل کریں اور وہ جو کچھ بھی چاہتے ہیں اسی سے چاہتے ہیں "وہ ایسے افراد ہیں جو خدا کو پکارتے ہیں اور اس کے تقرب کے لیے اس کی اطاعت کو وسیلہ بناتے ہیں "﴿أُوْلَئِکَ الَّذِینَ یَدْعُونَ یَبْتَغُونَ إِلیٰ رَبِّهِمْ الْوَسِیلَةَ﴾۔"ایسا وسیلہ جو قریب ترین ہو" ﴿أَیُّهُمْ أَقْرَبُ﴾۔"اور اس کے امیدوار ہیں" ﴿وَیَرْجُونَ رَحْمَتَهُ﴾۔"اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں" ﴿وَیَخَافُونَ عَذَابَهُ﴾۔"کیونکہ تیرے پروردگار کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ سب اس سے بچتے ہیں اور وحشت زدہ ہیں" ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُورًا﴾۔

اسلام کے عظیم مفسّرین نے "ایھم اقرب" کے مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض کہتے ہیں: یہ اولیاء خدا فرشتے ہوں یا انبیاء، ان میں سے جسے بھی معبود سمجھا گیا جتنا وہ اللہ کے زیادہ نزدیک ہو اتنا ہی مزید بارگاہ الٰہی میں تقرب کے درپے ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اپنی طرف سے کچھ بھی ہے خدا کی طرف سے ہے اور ان کا مقام و منزلت جتنا بلند ہوتا جاتا ہے ان کی طرف سے اطاعت و بندگی اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ [۳]

بعض کا نظریہ ہے کہ جملے کا مفہوم یوں ہے: وہ کوشش کرتے ہیں کہ تقربِ پروردگار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں ۔ گویا اطاعت پروردگار اور تقرب الٰہی کے راستے میں وہ ایک روحانی مقابلے میں شریک ہیں اور ہر ایک کی کوشش ہے کہ اس میدان میں دوسرے پر بازی لے جائے ۔ وہ لوگ جو ایسے ہوں کیا معبود ہوسکتے ہیں اور کیا وہ خدا سے ہٹ کر کوئی ذاتی حیثیت رکھتے ہیں ؟۔ (۴)

رہی یہ تفسیر کہ وہ ہر اس وسیلہ سے تقرب الٰہی چاہتے ہیں جو خدا کے زیادہ قریب ہو، بہت بعید احتمال ہے کیونکہ "ایہم" میں "ہم" کی ضمیر کہ جو عام طور پر جمع مذکر کے لیے ہوتی ہے اس معنی سے مناسبت نہیں رکھتی بلکہ اس طرح تو "ایہا" ہونا چاہیے تھا ۔ (۵)

۱۔ مجمع البیان اور تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں ۔

۲۔ کتاب مزامیر داؤد (زبور) جس صورت میں آج ہماری دسترس میں ہے اس کے مزمور ۳۷ کہیں ہے:

۳۔ اس تفسیر کے مطابق "ایہم" "یبتغون" کی ضمیر کا بدل ہے یا کسی محذوف کا ابتداء ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

"ایهم اقرب" هو اکثر دعاءً وابتغاءً للوسیلة

۴۔ اس صورت میں "ایہم" صرف "یبتغون" کی ضمیر کا بدل ہی ہوسکتا ہے ۔

۵۔ اس سے قطع نظر "ایهم اقرب" بتداء اور خبر کی صورت میں ہے حالانکہ اس معنی کے مطابق مفعول کی صورت میں یا مفعول سے بدل کی شکل میں ہونا چاہیے ۔ (غور کیجئے گا) ۔

"وسیلہ" کیا ہے؟

لفظ "وسیلہ" قرآن مجید میں دو مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ ایک آیات بالا میں اور دوسرا سورہ مائدہ کی آیہ ۳۵ میں۔
جیسا کہ ہم سورہ مائدہ کی آیہ ۳۵ کے ذیل میں کہہ چکے ہیں "وسیلہ" قرب حاصل کرنے کے معنی میں یا اس چیز کے معنی میں جو قرب کا باعث بنے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس کا مطلب ہے وہ نتیجہ جو قرب سے حاصل ہو۔
اس طرح سے "وسیلہ" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر اچھا کام اور ہر اچھی صفت شامل ہے کیونکہ یہ سب چیزیں قربِ پروردگار کا موجب ہیں۔
نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۱۰ میں اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کے انتہائی پُر مغز جملے ہیں:
بہترین وسیلہ کہ جس سے بندے قربِ خدا چاہتے ہیں خدا پر ایمان، قیام نماز، ادائیگی زکوٰۃ، ماہِ رمضان کے روزے ن حج و عمرہ، صلہ رحمی، راہ خدا میں پنہاں و آشکار انفاق اور تمام نیک اعمال ہیں کہ جو انسان کو زوال اور پستی سے نجات دیں۔ (۱)
اسی طرح نبیوں، خدا کے نیک بندوں اور اس کی بارگاہ کے مقرب لوگوں کی شفاعت بھی اسی کے تقرب کا ایک وسیلہ ہے اور اس شفاعت کو آیاتِ قرآن میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔
غلط فہمی نہ ہو۔ بارگاہِ پروردگار کے مقرب لوگوں سے توسل سے یہ مراد نہیں کہ انسان نبی یا امام سے مستقلاً تقاضا کرے یا اس مفہوم میں ان سے کسی مشکل کا حل چاہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے راستے پر چلے، اُن کے پروگراموں سے ہم آہنگ ہوجائے اور ان کے مقام و منزلت کا واسطہ دے کر خدا کو پکارے تاکہ خدا شفاعت و سفارش کی اجازت دے۔
(۲)

۱۔ تلخیص خطبہ ۱۰۰ نہج البلاغہ۔ اس کی تشریح ہم تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۲۷۶ (اردو ترجمہ) پر کر چکے ہیں۔

۲۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۲۷۷ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

آیات ۵۸،۵۹،۶۰

۵۸﴿وَإِنْ مِنْ قَرْيَةٍ إِلاَّ نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا﴾

۵۹﴿وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلاَّ أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلاَّ تَخْوِيفًا﴾

۶۰﴿وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلاَّ فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلاَّ طُغْيَانًا كَبِيرًا﴾

ترجمہ

۵۸۔ قیامت سے پہلے ہم ہر شہر اور آبادی کو ہلاک کریں گے یا (اگر گنہگار ہیں تو) انہیں سخت عذاب میں گرفتار کریں گے، یہ کتابِ الٰہی (لوح محفوظ) میں ثبت ہے۔

۵۹۔ ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں کہ ہم (بہانہ ساز لوگوں کے تقاضوں پر) یہ معجزات بھیجتے سوائے اس کے کہ گزرے ہوئے لوگوں نے (کہ جو اسی قسم کے تقاضے کرتے تھے اور انہی جیسے تھے انہوں نے) ان کی تکذیب کی۔ (انہی میں سے) ثمود کو ہم نے ناقہ دیا (اور وہ ایسا معجزہ تھا کہ) جو واضح اور روشن تھا لیکن انہوں نے اس پر ظلم کیا (اور ناقہ کو ہلاک کردیا) ہم معجزات صرف ڈرانے (اور اتمامِ حجت) کیلئے بھیجتے ہیں۔

۶۰۔ وہ وقت یاد کر جب ہم نے تجھ سے کہا کہ تیرا پروردگار لوگوں پر پوری طرح محیط ہے (اور ان کی کیفیت سے پوری طرح آگاہ ہے)۔ ہم نے جو خواب تجھے دکھایا تھا وہ صرف لوگوں کی آزمائش کے لیے تھا۔ اسی طرح جس شجرِ ملعونہ کا ہم نے قرآن میں ذکر کیا ہے، ہم انہیں ڈراتے (اور تنبیہ کرتے) ہیں لیکن ان کے طغیان و سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا۔

بہانہ سازوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرو

پہلے مشرکین سے توحید و معاد کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ بحث پہلی آیت میں بیدار کرنے کے انداز میں انہیں پند و نصیحت کی گئی ہے۔ اس میں ان کی نگاہِ عقل کے سامنے اس دنیا کے فانی ہونے کو مجسم کیا گیا ہے تاکہ وہ جان لیں کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے اور سرائے بقا کوئی دوسری جلہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرلیں۔ ارشاد ہوتا ہے: روئے زمین پر کوئی ایسی آبادی نہیں جس روزِ قیامت سے قبل ہم ہلاک نہ کریں یا اسے

عذابِ شدید میں گرفتار نہ کریں ﴿وَإِنْ مِنْ قَرْيَةٍ إِلاَّ نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا﴾۔ ستمگروں، بدکاروں اور سرکش باغیوں کو غذابِ شدید کے ذریعے ہلاک کردیں گے اور دوسرے طبعی موت یا عام حوادث ک سامنا کریں گے۔

آخر کار یہ دنیا ختم ہوجائے گی اور سب راہِ فنا اختیار کریں گے اور یہ ایک تسلیم شدہ اور قطعی اصول ہے کہ جو کتابِ الٰہی میں ثبت ہے (کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُورًا)۔ یہ کتاب وہی لوح محفوظ، پروردگار کا علم بے پایان اور عالم ہستی میں اس کے ناقابلِ تغیّر قوانین کا مجموعہ ہے۔ اس قطعی اور ناقابل تغیّر قوانین کا مجموعہ ہے، اس قطعی اور ناقابل تغیّر کتاب الٰہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے گراہوں، ستمگروں اور آلودہ مشرکین کو ابھی سے اپنے اعمال کے انجام کا اندازہ کرلینا چاہیے، انھیں جان لینا چاہیے کہ اگر وہ اس جہان کے اختتام تک زندہ رہے تو تھی آخرکار ان کے لئے فنا ہے اور اس کے بعد انھیں حساب اور جزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہاں ے مشرکین کا ایک اعتراض باقی رہ جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اچھا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہم ایمان لے آئیں گے لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ کہ ہم جس معجزے کی فرمائش کریں پیغمبر اسلام وہ پیش کریں اور در حقیقت ہمارے عذر بہانوں کے سامنے سر جھکادیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: ان معجزات کی تکذیب کی تھی ﴿وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلاَّ أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ﴾۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ معجزات جو صداقتِ پیغمبر کی دلیل ہیں کافی مقدار میں بھیجے جاچکے ہیں اور اب تمھارے من پسند کے معجزات اور تقاضے ایسے نہیں ہیں کہ جن سے موافقت کی جائے کیونکہ تم مشاہدہ کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤگے، اگر تم پوچھو کہ اس کی دلیل کیا ہے تو اس کی دلیل ان گزشتہ امتوں کا طرزِ عمل ہے جن کی حالت بالکل تم جیسی تھی وہ بھی بہانے تراشنے اور طرح طرح کے تقاضے کرتے تھے لیکن بعد میں وہ ایمان نہ لائے۔

اس کے بعد قرآن اس کی ایک واضح مثال بیان پیش کرتا ہے: ہم نے قوم ثمود کو ایک ناقہ دیا کہ جو واضح کرنے والا تھا ﴿وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً﴾۔

یہ اوٹنی تھی جو حکم خدا سے پہاڑ سے برآمد ہوئی، کیونکہ "انھوں نے ایسا ہی معجزہ طلب کیا" یہ ایک واضح اور واضح کرنے والا معجزہ تھا لیکن اس کے باوجود ایمان نہ لائے، "انھوں نے اس ناقہ ظلم کیا" اور اسے قتل کردیا ﴿فَظَلَمُوا بِهَا﴾

۔

اصولی طور پر ہمارا یہ پروگرام نہیں کہ جو شخص بھی معجزے کی فرمائش کرے ہمارا پیغمبر اسے قبول کرلے ”ہم تو لوگوں کو سوائے متنبہ کرنے اور ان پر اتمام حجّت کرنے کے، آیات و معجزات نہیں بھیجتے“ ﴿وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلاَّ تَخْوِيفًا﴾ ۔ ہمارے انبیاء معجزہ گر لوگ نہیں کہ بیٹھ جائیں اور جو شخص بھی کوئی بھی کوئی فرمائشِ معجزہ کرے اور اسے پورا کرتے ہیں، ان کا فریضہ بس یہ ہے کہ لوگوں تک دعوتِ الٰہی پہنچائیں، تعلیم وتربیت کریں اور حکومتِ عدل قائم کریں البتہ خدا سے اپنے رابطے کے اثبات کے لئے اس قدر معجزے پیش کریں کہ جو کافی ہوں اور بس۔

اس کے بعد دشمنوں کی سختی اور ہٹ دھرمی کے مقابلے میں، خدا تعالیٰ اپنے رسول کی دلجوئی کرتا ہے اور کہتا ہے: تیری باتیں سُن کر اگر یہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ”وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ تیرا پروردگار لوگوں کی کیفیت سے بخوبی آگاہ ہے اور ان پر احاطہ علمی رکھتا ہے“ ﴿وَإِذْ قُلْنَا لَکَ إِنَّ رَبَّکَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ﴾ ۔

ہمیشہ یہ ہوا کہ انبیاء کی دعوت سُن کر کچھ پاک دل لوگ ایمان لے آئے جبکہ متعصب اور ہٹ دھرم لوگ بہانہ تراشی، مخالفت اور دشمنی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، گزشتہ زمانے میں بھی ایسا ہی تھی اور اب ویسا ہی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے جو خواب تجھے دکھایا وہ صرف لوگوں کی آزمائش کے طور پر تھا ﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاکَ إِلاَّ فِتْنَةً لِلنَّاسِ﴾ ۔

اسی طرح جس شجرہ ملعونہ کی طرف ہم نے قرآن میں اشارہ کیا ہے وہ بھی لوگوں کی آزمائش کے لئے ہے (وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ) ۔

آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: ان کے دل اندھے اور ہٹ دھرم لوگوں کو ہم مختلف طریقوں سے ڈراتے ہیں لیکن اصلاحی اور تربیتی پروگرام ان کی سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتے ﴿وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلاَّ طُغْيَانًا کَبِيرًا﴾ ۔

کیونکہ انسان کا دل قبولِ حق کے لئے آمادہ نہ ہو تو صرف یہ کہ حق بات اس پر اثر نہیں کرتی بلکہ عام طور پر اس کا الٹا نتیجہ نلکتا ہے اور اس کی سختی و اصرار کی وجہ سے ان کی گمراہی اور ہٹ دھرمی بڑھ جاتی ہے (غور کیجئے گا) ۔

چند اہم نکات

۱۔ رسول اللہ کا خواب اور شجرہ ملعونہ:

اس ”رؤیا“ کے بارے مفسّرین میں بہت اختلاف ہے:

(الف) کچھ مفسّرین کا کہنا ہے کہ ”رؤیا“ یہاں خواب کے معنی میں نہیں ہے بلکہ آنکھ کا واقعی مشاہدہ ہے۔ ان مفسّرین نے اس واقعہ معراج کی طرف اشارہ سمجھ ہے کہ جس کا ذکر اسی سورہ کی ابتداء میں آیا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن کہتا ہے: معراج کا واقعہ لوگوں کے لئے آزمائش تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دن چڑھا تو رسول اللہ نے لوگوں کو واقعہ معجراج سنایا، اس پر بہت شور اٹھا۔ دشمن اس کا مذاق اڑانے لگے، کمزور ایمان والے اس پر شک کرنے لگے اور حقیقی مومنین نے اسے مکمل طور پر قبول کرلیا، کیونکہ قدرتِ الٰہی کے سامنے یہ سب مسائل معمولی ہیں۔

اس تفسیر پر ایک ہی اہم اعتراض ہے اور وہ یہ کہ لفظ ”رؤیا“ عام طور پر خواب کے معنی میں ہے نہ کہ جاگتے ہوئے دیکھنے کے معنی میں۔

(ب) ابنِ عباس سے منقول ہے کہ ”رؤیا“ اس خواب کی طرف اشارہ ہے جو آپ نے (ہجرت کے چھٹے برس) حدیبیہ کے سال میں مدینہ میں دیکھا تھا اور لوگوں کو بشارت دی تھی کہ تم جلدی ہی قریش پر فتح پاؤگے اور بڑے امن و آرام سے مسجد الحرام میں داخل ہوجاؤگے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس سال اس خواب نے عملی صورت اختیار نہ کی بلکہ دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر صورزت پذیر ہوا لیکن اتنی تاخیر کی وجہ سے مومنین آزمائش میں سے گزرے اور کمزور ایمان والے شک میں پڑگئے حالانکہ رسول اللہ نے ان سے بالصراحت فرمایا کہ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس سال مکّہ جاؤگے بلکہ مَیں نے کہا تھا کہ جلد ایسا ہوگا (اور اسی طرح ہوا)۔

اس تفسیر پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہ سورہ بنی اسرائیل مکّی سورتوں میں سے ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال میں ہوا۔

(ج) بعض سُنی اور شیعہ مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ایک مہور خواب کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہ نے دیکھا کہ بندر آپ کے منبر پر اُچھل کود رہے ہیں، اس پر آپ بہت غمگین ہوئے اور اس واقعہ کے بعد آپ بہت کم ہنستے تھے۔

(ان بندروں سے بنی امیہ مرادلی گئی ہے، وہ یکے بعد دیگرے رسول اللہ کی جگہ اور منبر پر بیٹھتے انھوں نے اس میں ایک دوسرے کی تقلید کی، وہ بے حیثیت افراد تھے۔ وہ اسلامی حکومت اور خلافتِ رسول اللہ کو تباہی کی طرف لے گئے)۔

یہ تفسیر فخرالدین رازی نے "تفسیر کبیر" میں اہل سنت کے مشہور مفسّر قرطبی نے تفسیر الجامع میں طبرسی نے مجمع البیان میں اور متعدد دیگر مفسرین نے نقل کی ہے۔

مرحوم فیض کاشانی تفسیر صافی میں کہتے ہیں کہ یہ روایت عامہ اور خاصہ میں مشہور روایات میں سے ہے۔

البتہ یہ تینوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی ہیں، ہوسکتا ہے یہ تینوں آیت میں جمع ہوں لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے دوسری تفسیر سورہ کے مکّی ہونے سے مناسبت نہیں رکھتی۔

"شجرہ ملعونہ" کے بارے میں اسی طرح متعدد تفاسیر ہیں:

الف) قران میں جس "شجرہ ملعونہ" کا ذکر ہے وہ "شجرہ زقوم" ہے۔ یہ وہ درخت ہے جو سورہ صافّات کی آیہ ۶۴ کے مطابق جہنّم کی بنیاد میں اُگے گا۔ اس کا پھل ناگوار اور رنج آور ہوگا، قرآنی الفاظ ہیں:

﴿إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ﴾

"یہ وہ درخت ہے جو جہنّم کی بنیاد سے اٹھے گا"۔

سورہ دخان کی آیت ۴۶ اور ۴۷ کے مطابق یہ درخت گنہگاروں کی خوراک ہے۔ یہ اس دنیا کے کھانوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ پگھلی ہوئی دھات کی طرح دل میں جوش مارے گا، اس کی مکمل تفسیر انشاء اللہ سورہ دخان کی آیات کے ذیل میں آئے گی۔

اس میں شک نہیں کہ "شجرہ زقوم" اس دنیا کے درختوں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا، اسی بناء پر آگ کے اندر سے اُگے گا۔

واضح ہے کہ اس قوم کے مسائل کے جو دوسرے جہان سے مربوط ہیں ہمارے لئے تو ایک خیالی تصویر کی طرح ہیں جسے دور سے دیکھا جائے تو بس سیاہی سی معلوم ہوتی ہے۔

مشرکینِ قریش قرآن کی اس تعبیر کا مذاق اڑاتے تھے، ابوجہل کہتا تھا:

محمد تمھیں ایسی آگ کی دھمکی دیتا ہے جو پتھروں کو جلائے گی اور اس کا خیال ہے کہ دوزخ میں درخت اُگے گا۔

نیز یہ بھی منقول ہے وہ تمسخر کے طور پر کھجوریں اور مکھن منگواتا، انھیں کھاتا اور اپنے ساتھیوں سے کہتا: اسے کھاؤ یہی زقوم ہے۔ [۱]

اس بناء پر قران زیرِ بحث آیات میں شجرہ ملعونہ کا لوگوں کی آزمائش کے ذریعے کے طور پر تعارف کرواتا ہے کیونکہ ہٹ دھرم مشرک اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور سچّے مومنین سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ یہ درخت قرآن میں "شجرہ ملعونہ" کے نام سے نہیں آیا، اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے مراد کھانے والوں پر لعنت ہو، علاوہ ازیں لعنت رحمتِ خدا سے دوری کے علاوہ کچھ نہیں اور واضح ہےں کہ ایسا درخت رحمتِ پروردگار سے بہت دور ہے۔

ب) "شجرہ ملعونہ" سے مراد سرکش یہودی قوم ہے، وہ ایسے درخت کی طرح ہیں جس کی بہت شاخیں اور پتّے ہیں لیکن بارگاہِ الٰہی میں دھتکارے ہوئے ہیں۔

ج) بہت سے شیعہ اور سُنّی تفاسیر میں منقول ہے کہ شجرہ ملعونہ بنی امیہ ہیں۔ فخرِ رازی نے مشہور اسلامی مفسّر ابن عباس سے اس سلسلے میں اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے:

یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ (ص) وسلّم کے خواب کے بارے میں مذکورہ بالا روایت سے بھی مناسبت رکھتی ہے۔ نیز اس حدیث سے بھی مناسبت رکھتی ہے جو حضرت عائشہ سے منقول ہے، انھوں نے مروان کی طرف منہ کرکے کہا: لعن اللہ أباک وأنت فی صلبه فانت بعض من لعنه اللہ۔

اللہ نے تیرے باپ پر لعنت کی جبکہ تُو اس کی صلب میں تھا لہٰذا تُو اس کا ایک حصّہ ہے جس پر خدا نے لعنت کی ہے۔ (۲)

یہاں پھر ایک سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن میں کہاں بنی امیہ کے شجرہ پر لعنت ہوئی ہے۔ جواب یہ ہے کہ سورہ ابراہیم میں آیہ ۲۶ میں، جہاں شجرہ خبیثہ کا ذکر آیا ہے۔ اگر شجرہ خبیثہ کے وسیع مفہوم کی طرف نظر رکھی جائے اور اس آیت کی تفسیر میں وارد روایات کہ جن میں بنی امیہ کو شجرہ خبیثہ قرار دیا گیا ہے کہ طرف توجہ کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ "خبیثہ" معنی کے لحاظ سے لفظ "ملعونہ" کے ساتھ لازم و ملزوم ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں بنی امیہ کے شجرہ خبیثہ پر لعنت ہوئی ہے۔ (۳)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہ تمام تریا زیادہ تر تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں ممکن ہے ہر منافق، خبیث اور درگاہِ الٰہی سے راندہ ہوا شجرہ ملعونہ کے مفہوم میں شامل ہو اور خصوصاً بنی امیہ، سنگدل، ہٹ دھرم یہودی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تمام لوگ اس سے مراد ہوں اور ہوسکتا ہے شجرہ زقوم دوسرے جہان میں انہی شجراتِ خبیثہ کی تجسیم ہو اور یہ سب شجرات خبیثہ اِس جہان میں سچّے مومنین کی آزمائش اور امتحان کا باعث ہوں۔

وہ یہودی کہ جو آج کل حساس اسلامی مراکز پر غاصبانہ طور پر مسلط ہوں اور ہر لمحہ دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں آگ لگا رہے ہیں اور جو کچھ جرائم اور بے انصافیاں کررہے ہیں، اسی طرح وہ منافقین جن کے ان سے سیاسی یا غیر سیاسی روابط ہیں اور تمام آمر حکمران کہ جنھوں نے اسلام کا راستہ چھوڑکر اسلامی ممالک میں بنی امیہ کا راستہ اپنا رکھا ہے اور معاشرے کے منظر سے نیک لوگوں کو دُور کررکھا ہے، جنھوں نے پست اور کمینے افراد کو عوام کے سروں پر مسلط کررکھا ہے، وہ کہ جو داستانِ حق پر مظالم ڈھارہے ہیں اور سچّے مجاہدین کو شہید کررہے ہیں، وہ جنھوں نے ایسے افراد کے ہاتھ میں معاشرے کی باگ ڈور دے رکھی ہے جو دَورِ جاہلیت کی یادگارہیں۔ یہ سب "شجرہ ملعونہ" کے شاخ وبرگ ہیں اور لوگوں کے لئے آزمائش اور امتحان کا باعث ہیں۔

۱۔ تفسیر روح المعانی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر قرطبی، ج۶، ص۳۹۰۲ اور تفسیر فخر رازی، ج۲۰، ص۲۳۷-

۳۔ نور الثقلین، ج۲، ص۵۳۸-

۲۔ منکرینِ اعجاز کی عذرتراشیاں

ہمارے زمانے کے بعض بے خیر افراد یہ راگ الاپتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا قرآن کے علاوہ کوئی معجزہ نہ تھا، اپنی اس بات کے لئے وہ کئی طرح کے بہانے تراشتے ہیں، وہ "وَمَا مَنَعنَا أن نُرسِلَ بِالآیاتِ"کو بھی اس بات کی دلیل بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے گزشتہ انبیاء کے برخلاف کوئی معجزہ پیش نہیں کیا لیکن تعجب کی بات ہے کہ وہ آیت کے ابتدائی حصّے کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن آخری حصّے کو چھوڑ دیتے ہیں جس میں ہے کہ:

﴿وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلاَّ تَخْوِيفًا﴾

ہم آیات صرف مخالفین کو ڈارنے کے لئے بھیجتے ہیں۔

یہ تعبیر ناشاندہی کرتی ہے کہ معجزات دو قسم کے ہیں، ایک قسم ان معجزات کی ہے جو دعوتِ رسول کی صداقت ثابت کرنے کے لئے، اہل ایمان کی تشویق کے لئے اور منکرین کو ڈرانے کے لئے ضروری ہیں، جبکہ دوسری قسم ان من پسند معجزات کی ہے جن کا تقاضا بے بہانہ جوئی کے طور پر کرتے تھے، تاریخ انبیاء میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، انبیاء نے ایسے معجزات منکرین کے سامنے پیش کئے لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائے۔

اسی لئے وہ لوگ خدائی عذاب میں گرفتار ہوئے کیونکہ ان مجوزہ معجزات کے ظہور پذیر ہونے کے باوجود وہ ایمان نہ لائے لہٰذا فوری عذاب کے مستحق قرار پائے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں قرآن جس چیز کی پیغمبر اسلام کے بارے میں نفی کر رہا ہے وہ صرف دوسری قسم کے معجزات ہیں نہ کہ پہلی قسم کے معجزات کی کیونکہ ان کا دعویٰ نبوت کے ثبوت کے لئے ناگزیر ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن خود تنہا ایک واضح اور جاوداں معجزہ ہے اور اگر اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا کوئی اور معجزہ نہ بھی ہوتا تب بھی آپ کی دعوت صداقت ہمارے لئے ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ قران آپ کا روحانی اور معنوی معجزہ ہے اور اہلِ فکر ونظر کے لئے یہ بہترین شاہد ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس معجزے کو اگر دوسرے محسوس مادی معجزات کے ساتھ ملادیا جائے تو عامۃ الناس کے لئے انتہائی اہم ہوجائے بالخصوص جبکہ قرآن نے دیگر انبیاء کے لئے ایسے معجزے کا بارہا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان معجزات

کا ذکر اس بات کا سبب ہے کہ لوگ آپ سے تقاضا کریں کہ آپ کیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ سب انبیاء الٰہی سے افضل اور آخری پیغمبر ہیں جبکہ ان کے معجزات میں سے چھوٹا یا معجزہ بھی پیش کر سکے ۔

یقیناً اس سوال کا مطمئن کرنے والا جواب اس کے علاوہ نہ تھا کہ پیغمبرِ اکرم انبیائے سلف کے معجزات کا نمونہ پیش کریں اور متواتر اسلامی تاریخ بھی کہتی ہے کہ رسول اللہ نے ایسے معجزات دکھائے ۔

قرآن کی متعدد آیات میں ان معجزات کے نمونے موجود ہیں ، مثلاً آئندہ کے واقعات کے بارے میں مختلف پیش گوئیاں ، دشمن کے خلاف فرشتوں کا لشکر اسلام کی مدد کرنا اسی طرح دیگر معجزات خصوصاً وہ معجزات جو اسلامی جنگوں میں وقوع پذیر ہوئے ۔

۳۔ گزشتہ لوگوں کے انکار کا آئندہ لوگوں سے تعلق؟

مندرجہ بالا آیات میں قرآن کہتا ہے کہ گزشتہ لوگوں نے چونکہ معجزات کا طالبہ کیا تھا اور ان کے ظہور پذیر ہونے کے باوجود انھوں نے تکذیب کی لہٰذا اس سلسلے میں اب تمھارے مطالبے تسلیم نہیں کئے جا سکتے ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا گزشتہ لوگوں کی تکذیب بعد کی نسلوں کی محرومیت کا سبب بن سکتی ہے؟

جو کچھ سطور گزشتہ میں کہا گیا ہے اس سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے ۔ یہ ایک رائج طریقہ ہے کہ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہم تمھاری بہانہ سازیوں کو نہیں مانتے، اگر دوسرا پوچھے کہ کیوں ؟ تو ہم کہتے ہیں کہ پہلے بھی ایسا ہوچکا ہے کہ لوگوں نے ایسے تقاضے کئے تھے مگر بعد میں حق کو تسلیم نہیں کیا تمھاری کیفیت بھی انھی جیسی ہے ۔ اس کے علاوہ تم ان کی روش کی تائید کرتے ہو اور عملی طور پر تم نے ثابت کیا ہے کہ تمہارا مقصد تحقیق و جستجو نہیں ہے بلکہ تو تم صرف بہانے تراشتے ہو اور پھر ہٹ دھرمی، ڈھٹائی اور انکار پر باقی رہتے ہو لہٰذا تمھارے تقاضوں کا کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا ۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ نے خبر دی کہ جہنم کی گہرائیوں میں ایک درخت اُگے گا کہ جو ان اوصاف کا حامل ہوگا اور اس سے اہلِ دوزخ کو غذا حاصل ہوگی، تو وہ فوراً تمسخر اڑانے لگے، کبھی کہتے کہ "زقوم" کھجور اور مکھن کے علاوہ کچھ نہیں ، آؤ یہ میٹھی اور روغنی غذا "زقوم" کی یاد میں کھائیں اور کبھی کہتے کہ جس دوزخ کے پتھروں میں سے اُگے گی اس میں درخت کیسے اُگے گا حالانکہ واضح تھا کہ وہ درخت اس جہان کے درختوں کی مانند نہیں ہے ۔

آیات ۶۵،۶۴،۶۳،۶۲،۶۱

۶۱﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلاَّ إِبْلِيسَ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا﴾

۶۲﴿قَالَ أَرَأَيْتَكَ هٰذَا الَّذِی كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِی إِلیٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلاَّ قَلِيلًا﴾

۶۳﴿قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاءً مَوْفُورًا﴾

۶۴﴿وَاسْتَفْزِزْ مَنْ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِی الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمْ الشَّيْطَانُ إِلاَّ غُرُورًا﴾

۶۵﴿إِنَّ عِبَادِی لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفیٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾

ترجمہ

۶۱۔ وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ جس نے کہا کہ کیا ایسے کو سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۶۲۔ (پھر) اس نے کہا یہ شخص جسے تُو نے مجھ پر ترجیح دی ہے اگر تو نے مجھے قیامت تک زندہ رکھا تو تھوڑے سے افراد کے سوا اس شخص کی ساری اولاد کو گمراہ کروں گا اور ان کی بیخ کُنی کروں گا۔

۶۳۔ فرمایا: نکل جا، ان میں سے جو شخص بھی تیری اتباع کرے گا اس کی سزا جہنم ہے اور یہ بہت سخت سزا ہے۔

۶۴۔ ان میں سے جس پر تیرا بس چلے اسے آواز دے کر ابھار اور اپنے سوار اور پیادہ لشکر کو ان پر لگادے اور مال اور اولاد میں سے ان کے ساتھ شریک ہو اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر، لیکن شیطان کا وعدہ سوائے جھوٹ اور فریب کے کچھ نہیں ہے۔

۶۵۔ (لیکن جان لے) تُو ہرگز میرے بندوں پر تسلّط حاصل نہیں کرسکے گا (اور وہ کبھی تیرے دام میں گرفتار نہیں ہوں گے) یہی کافی ہے کہ تیرا پروردگار ان کا محافظ ووکیل ہے۔

شیطان کے جال

یہ آیات ابلیس کی رُوگردانی کے بارے میں ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے آدم(ص) کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے انکار کردیا، علاوہ ازیں اس میں اس کے بُرے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز اس واقعے کے بعد کے کچھ امور کا بھی ذکر ہے۔

قبل ازیں ہٹ دھرم مشرکین سے متعلق مباحث تھیں ، ان کے بعد شیطان کے بارے میں یہ آیات اس طرف اشارہ ہیں کہ شیطان استکبار اور کفر و عصیان کا مکمل نمونہ تھا ۔ دیکھو کہ اس کا کیا انجام ہوا لہٰذا تم کہ جو اس کے پیروکار ہو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا ۔

علاوہ ازیں یہ آیات اِس طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ یہ دل کے اندھے مشرکین کہ جو خلافِ حق راستے پر ڈٹے ہوئے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ شیطان کئی طریقوں سے انہیں گمراہ کرنے کے درپے ہے اور درحقیقت وہ اپنے اس پروگرام پر عمل پیرا ہے کہ جس کا اعلان اس نے اِن الفاظ میں کیا تھا:

میں اکثر اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا ۔

پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم(ص) کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب سجدہ ریز ہوگئے ﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلاَئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلاَّ إِبْلِيسَ﴾ ۔

جیسا کہ خلقتِ آدم(ص) سے مربوط آیات کی تفسیر میں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ سجدہ ایک طرح کا خضوع اور اظہارِ احترام تھا اور اس سے خلقتِ آدم(ص) کی عظمت اور دیگر مخلوقات کی نسبت ان کے امتیازی مقام کے اظہار کے طور پر تھا اور یہ عبادت کے طور پر خدا کو سجدہ تھا کہ اس نے ایسی عجیب و غریب مخلوق پیدا کی ہے ۔

ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اگرچہ یہاں ابلیس کا ذکر فرشتوں کے ساتھ آیا ہے لیکن قرآن کی شہادت کے مطابق ان میں سے نہیں تھا بلکہ بندگی خدا کے باعث ان کی صف میں جا پہنچا تھا ۔ وہ جنّات میں سے تھا اور اس کی خلقت مادی تھی۔ ابلیس کے سر پر غرور و تکبر سوار تھا ۔ خود بینی نے اس کی عقل و ہوش پر پردہ ڈال رکھا تھا ۔ اسے گمان تھا کہ مٹی آگ سے بہت کم حیثیت کی حامل ہے جبکہ مٹی تمام برکات کا منبع اور سرچشمہ حیات ہے ۔ اس نے اعتراض کے لہجے میں بارگاہِ خداوندی میں کہ-: کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جسے تو نے گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے

﴿قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا﴾ ۔

جس وقت اس نے دیکھا کہ فرمانِ خدا کے سامنے غرور و تکبر اور سرکشی کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی بارگاہِ مقدس سے دھتکار دیا گیا ہے تو اس نے عرض کیا، اگر تو مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے تو جسے تو نے مجھ پر ترجیح دی ہے اور اعزاز بخشا ہے میں تھوڑے سے افراد کے سوا اس کی ساری اولاد کو گمراہ کردوں گا اور اس کی بیخ کنی کردوں گا ﴿قَالَ أَرَأَيْتَكَ هٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِي إِلىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلاَّ قَلِيلًا﴾ [۱] ۔

جسے تونے ترجیح دی ہے کیا اس شخص کو تونے دیکھا ہے؟ اگر مجھے زندہ رہنے دیا تو تو دیکھے گا میں اس کی اکثر اولاد کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔

دوسرا احتمال آیت کی ترکیب اور معنی کے لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

"احتنکن""احتناک" کے مادہ سے کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے معنی میں ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ٹڈی دل زراعت کو بالکل کھاجائے تو عرب کہتے ہیں:"احتنک الجراد الزرع"

لہٰذا مذکورہ گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ میں معدودِچند افراد کے سوا ساری اولادِ آدم کو تیرے جادئہ و اطاعت سے ہٹادوں گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "احتنکن""حنک" کے مادہ سے زیر گلو اور زیر حلق کے معنی میں ہو جس وقت جانور کی گردن میں رسی یا لگام ڈالتے ہیں تو عرب اسے "حنتک الدابہ" کہتے ہیں۔

اِس بناء پر مذکورہ گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کہتا ہے کہ میں سب کی گردن میں وسوسے کی رسّی ڈال دوں گا اور انہیں گناہ کے راستے کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیطان کو مہلت دے دی گئی تاکہ ساری اولاد آدم کے لیے میدان امتحان معرضِ وجود میں آجائے اور حقیقی مومنین کی تربیت کا وسیلہ فراہم ہوجائے کیونکہ حوادث کی بھٹی میں انسان ہمیشہ پختہ تر ہوتا ہے اور طاقتور دشمن کے مقابلے میں دلیر ہوجاتا ہے۔ فرمایا: نکل جا، ان میں سے جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے ان کی سزا جہنم ہوگی اور یہ بہت سزا ہے ﴿قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُکُمْ جَزَاءً مَوْفُورًا﴾۔

اس ذریعے سے آزمائش کا اعلان کیا گیا ہے اور آخر میں اس عظیم خدائی آزمائش میں کامیابی اور شکست کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد شیطان کے ان ہتھکنڈوں، حربوں اور وسائل کا ذکر کیا گیا جن سے وہ کام لیتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت واضح اور جاذبِ توجہ انداز میں فرمایا گیا ہے: ان میں سے ہر ایک کو اپنی آواز کے ذریعے تحریک کرسکتا ہے اور وسوسے میں ڈال سکتا ہے ﴿وَاسْتَفْزِزْ مَنْ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِکَ﴾۔ اور اپنی پکار کے ذریعے اپنے سوار اور پیادہ لشکر کو ان کی طرف ہانک سکتا ہے ﴿وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِکَ وَرَجِلِکَ﴾۔ وہ ان کے اموال اور اولاد میں شریک ہوجاتا ہے ﴿وَشَارِکْهُمْ فِی الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلاَدِ﴾۔ اور اپنے جھوٹے وعدوں کے ذریعے انہیں فریب دیتا ہے (وَعِدْهُمْ)۔ اس کے بعد

قرآن خبردار کرتا ہے: شیطان فریب، دھوکہ اور غرور پر مبنی وعدوں کے علاوہ کچھ نہیں دیتا ﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلاَّ غُرُورًا﴾۔

پھر خدا اس سے کہتا ہے: لیکن جان لے کہ "میرے بندوں پر تیرا کچھ بس نہ چلے گا" ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾۔ اتنا ہی کافی ہے تیرا پروردگار ان بندوں کا ولی و حافظ ہے ﴿وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾۔

۱۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "ارءیتک" کا کاف حرفِ خطاب ہے کہ جو تاکید کے طور پر آیا ہے اور "ارءیتک" کا معنی "اخبرنی" (مجھے خبر دے) ہے جس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر میں اس طرح تھا: اور مجموعی طور پر اس کا یہ معنی ہو:

چند اہم نکات

۱۔ چند الفاظ کا مفہوم:

"استفزز""استفزاز" کے مادہ سے تحریک کرنا اور ابھارنا کے معنی میں ہے۔ اس میں سریع اور سادہ تحریک کا مفہوم پنہاں ہے لیکن در اصل یہ لفظ قطع و برید کرنے کے معنی میں ہے۔ اس لیے جب کوئی کپڑا یا لباس پھٹ جائے تو عرب کہتے ہیں: تفزز الثوب

تحریک پانے اور برانگیختہ ہونے کے معنی حق سے قطع ہونے اور باطل کی طرف ملتفت ہو جانے کی وجہ سے ہے۔

"اجلب""اجلاب" کے مادہ در اصل "جلبہ" یعنی سخت قسم کی چیخ و پکار کے معنی میں ہے۔ "اجلاب" کے معنی ہے شور و غل مچا کر ہانکنا اور چلانا۔ بعض روایات میں "جلب" سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور شخص حقِ شرعی لینے کے لیے چراگاہ میں جائے تو چِلّائے نہیں کہ کہیں چراگاہ کے چوپائے وحشت زدہ ہوجائیں یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ گھڑ سواری کے مقابلے میں شریک کوئی بھی دوسرے کے گھوڑے کے سامنے غُل غپاڑہ نہ کرے تاکہ وہ خود دوڑ لگاتے۔ (۱)

"خیل" دو معانی میں آیا ہے۔ گھوڑوں کے معنی میں اور گھڑ سواروں کے معنی میں۔ یہاں البتہ دوسرے معنی میں ہے اور سوار لشکر کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے برعکس "رجل" پیادہ لشکر کے معنی میں ہے۔

البتہ شیطان کا سوار اور پیادہ لشکر کسی باقاعدہ فوج کے مفہوم میں نہیں ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ خود اس کی اپنی جنس میں سے اور انسانوں میں سے بہت سے افراد گمراہی اور بے راہ روی پھیلانے کے لیے اس کے مددگار ارو ساتھی ہیں ۔اس کے ان مددگاروں میں بعض زیادہ طاقتور ہیں کہ جو سوار لشکر کی طرح ہیں اور بعض نسبتاً سست ہیں کہ جو پیادہ لشکر کی طرح ہیں۔

۲۔ وسوسے کے لیے شیطانی ذرائع:

مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ مخاطب شیطان ہے اور خدا تعالیٰ تہدید آمیز لہجے میں اس سے کہتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ ہوسکتا ہے کرلے مختلف ذرائع سے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن یہ در حقیقت تمام انسانوں کے لیے

تنبیہ اور بیداری کا الارم ہے ۔ انہیں شیطانی ہتھکنڈوں سے آگاہ کیا گیا ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح وسوسے پیدا کرتا ہے ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں شیطانی ذرائع کے چا اہم اور بنیادی حصوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ ان سے خبردار رہیں :

الف۔ شیطانی کا پہلا ہتکھنڈا پراپیگنڈا ہے:

ابھی ہم نے پڑھا ہے:"﴿واستغفزز من استطعت منهم بصوتک﴾"

بعض مفسرین نے اس جملے سے صرف ہوس انگیز گانوں اور موسیقی کا مفہوم لیا ہے لیکن اس کا مفہوم وسیع تر ہے ۔ اس میں سمعی اور صوتی ذرائع سے کیا جانے والا تمام تر گمراہ کن پراپیگنڈا شامل ہے ۔ آج کی دنیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی دنیا ہے ۔ آج کی دنیا وسیع سمعی و بصری کی دنیا ہے ۔ آج کی دنیا میں آواز کے ذریعے کو استعمال کررہے ہیں ۔ یہ لوگ بہت زیادہ دولت اسی راستے پر خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ حق سے گمراہ کرسکیں ، وہی راہِ حق کہ جو حریت و استقلال اور ایمان و تقویٰ کی راہ ہے ۔ وہ انسانوں کو بے ارادہ اور کمزور غلاموں میں بدل دینا چاہتے ہیں ۔

ب۔ شیطان کا دوسرا ہتھکنڈا فوجی قوت کا استعمال ہے:

شیطان کا یہ طرز عمل صرف ہمارے زمانے ہی میں نہیں ۔ فوجی طاقت ہمیشہ سے ظالموں اور جابروں کا اہم اور خطرناک ہتھیار رہا ہے ۔ جب بھی وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں فوری طورپر اپنی مسلح طاقتوں کو پکارتے ہیں اور ان علاقوں کی طرف روانہ کردیتے ہیں جہاں وہ محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں میں آزادی اور استقلال کی تڑپ پیدا ہورہی ہے اور خطرہ ہے کہ وہ پھر سے آزادی حاصل نہ کرلیں ۔

۱۔ امریکہ نے ایران کے خلاف یہ فوج تیار کی تھی اسے انگریزی میں Rapid Deplyed Army کا نام دیا گیا تھا ۔ (مصحح) ۔

خود آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ سریع الحرکت فوج[1] تیار کی گئی ہے جو بالکل "اجلاب" کا مفہوم رکھتی ہے ۔ اسی طرح مغرب کی بعض دیگر طاغوتی طاقتوں نے بھی خاص فوج تیار کی ہے تاکہ دنیا کے جس کسی حصے میں بھی ان کے غیر شرعی شیطانی مفادات کو خطرہ ہو اُسے وہاں بھیج سکیں اور حق کی ہر آواز اور حرکت کو دبا سکیں ۔ یہ جاسوس درحقیقت ان کا

پیادہ لشکر ہے۔ یہ طاقتیں اس بات سے غافل ہیں کہ خدا کا اپنے سچے بندوں سے وعدہ ہے کہ شیطان اور اس کی فوج ہرگز ان پر غلبہ حاصل نہیں کرسکے گی۔

ج۔ اقتصادی ہتھکنڈا:

یہ ظاہراً انسانی طرزِ عمل معلوم ہوتا ہے لیکندر حقیقت شیطانی اثر و نفوذ کے لیے مالی و اقتصادی امور میں شرکت کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔

بعض مفسرین نے اموال میں شرکت سے صرف سود اور اولاد میں شرکت سے صرف غیر شرعی اولادمراد لیا ہے۔ (۲)

حالانکہ ان کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہر طرح کا حرام مال اور ہر طرح کی غیر شرعی اولاد وغیرہ شامل ہے۔

ہم خود اپنے اس زمانے میں دیکھتے ہیں کہ عالمی شیطانی سامراجی انسان دشمن قوتیں کس کس طرح سرمایہ لگاتی ہیں۔ یہ طاقتیں اقتصادی کمیٹیاں قائم کرتی ہیں کمزور ملکوں میں مختلف قسم کے کارخانے لگاتی ہیں اور پیدا واری مراکز قائم کرتی ہیں پھر ان کے ذریعے طرح طرح کے خطرناک کھیل کھیلتی ہیں۔ یہ طاقتیں فنی اور اقتصادی ماہرین کے نام پر ان ملکوں میں اپنے جاسوس بھیجتی ہیں اور ہمدردبن کر ان ملکوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتی ہیں۔ یہ طاقتیں ان ملکوں میں ان ذرائع سے اقتصادی ترقی، استقلال اور خود مختاری پر ضرب لگاتی ہیں اور انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔

اسی طرح یہ شیطانی قوتیں اسکولوں، کالجوں، لائبریریوں، ہسپتالوں اور سیاحت کے راستے ان کی اولاد میں شرکت کرتی ہیں۔ ان ممالک میں بعض افراد کو اپنے ہاں اعلیٰ تعلیم کے نام پر بلاتی ہیں اور ان ملکوں کے جوانوں کو اپنی تمدن و ثقافت کے رنگ میں پوری طرح رنگ لیتی ہیں اور اس طرح ان کے افکار و نظریات میں شریک ہوجاتی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے اس قسم کی تفاسیر بعض واضح مصادیق کو بیان کرتی ہیں البتہ آیت کا مفہوم انہی میں منحصر نہیں ہے۔ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۱۸۴ کی طرف رجوع کریں۔

یہ شیطان برائی کے مراکز بھی قائم کرتے ہیں۔ انٹر نیشنل ہوٹلوں، جدید تفریحی کلبوں، سینماؤں اور گمراہ کن فلموں کے ذریعے قوموں کا اخلاق تباہ کرتے ہیں۔ صرف ان ذرائع سے برائیوں ہی کو جنم نہیں دیتے بلکہ غیر شرعی اولاد میں بھی اضافے کا باعث بنتے ہیں بلکہ ان ذرائع سے یہ شیطان ایک بھٹکی ہوئی، بے راہ رو، بے ارادہ، اوباش اور ہوس پرست نسل کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ان کے طور طریقوں پر ہم جتنا گہرا غور کریں گے اتنا زیادہ ان کے خطرناک شیطانی وسوسوں کی گہرائی سے آشنا ہوں گے ۔

۱۔ مفردات راغب اور مجمع البیان کی طرف رجوع کریں ۔

۲۔ ان آیات کے بارے میں وارد روایات میں بھی شیطان کے شریک اولاد ہونے کا مفہوم۔ غیر شرعی اولاد یا وہ اولاد جن کا نطفہ مالِ حرام سے بنا اور یا نطفہ ٹھہرتے وقت جن کے ماں باپ یادِ خدا سے غافل تھے، بیان کیا گیا ہے ۔

د۔ نفسانی تباہی کے شیطانی پروگرام:

مغرور کرنے والے اور طرح طرح کے پُر فریب وعدے، شیطانوں کا ایک اور چلن ہیں ۔ انہوں نے لوگوں کو فریب دینے کے لیے بڑے بڑے ماہرین نفسیات رکھے ہوئے ہیں ۔ ان کا کام لوگوں کو حقائق سے غافل کرنا ہے ۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ عظیم تمدن کا دروازہ تم سے چند قدم دور ہے ۔ کبھی سمجھاتے ہیں کہ تم جلد ہی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہوجاؤ گے ۔ کبھی کہتے ہیں کہ تمہاری قوم بڑی عظیم ہے جو اس پروگرام پر عمل کرکے اوج عظمت تک جا پہنچے گی۔ وہ پسماندہ قوموں اور لوگوں کو انہی تصورات میں لگائے رکھتے ہیں اور یہ سب کام "وعدہم" کا مصداق ہیں ۔

کبھی وہ اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں ۔ تحقیر و تضعیف کرتے ہیں ۔ چھوٹے اور کمزور ملکوں سے کہتے ہیں کہ تم بڑی عالمی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے ۔ تمہارے اور ترقی یافتہ ممالک میں سینکڑوں سالوں کا فرق ہے ۔ اس طرح یہ شیطان انہیں ہمت و کوشش سے روکتے ہیں ۔

یہ قصّہ بہت طویل ہے ۔ شیطان اور اس کے لشکروں کے نفوذ کا کوئی ایک طریقہ نہیں ۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں "عباد اللہ" اور خدا کے سچے بندے ہمت نہیں ہارتے، ان کے وہ جذبے اسی طرح سلامت رہتے ہیں کہ جو وہ ان آیات سے حاصل کرتے ہیں ۔ ان آیات میں وہ خدا کا قطعی وعدہ دیکھتے ہوئے ان شیطانوں کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ذرہ بھر خوف نہیں کھاتے ۔ وہ جانتے ہیں کہ شیطانوں کا شور و غل جتنا زیادہ ہو اتنا ہی بے معنی اور کھوکھلا ہوتا ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ قوت ایمان اور توکل علی اللہ سے ان سب پر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کہا جاسکتا ہے ۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:"﴿و کفٰی بربک وکیلاً﴾"

خدا ان کا بہترین محافظ، نگہبان اور یار و مددگار ہے

۳۔ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟:

اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیہ ۳۶ کی تفسیر میں ہم تفصیلی بحث کرچکے ہیں ۔ اسی طرح مختلف طرح کے شیطانی وسوسوں اور لفظ شیطان کے سلسلہ میں ج ۶ ص ۱۱۲ اور ج ۱ ص ۱۶۶ پر بحث کی جاچکی ہے ۔ (اردو ترجمہ)

آیات ۶۹،۶۸،۶۷،۶۶

۶۶﴿رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾۔

۶۷﴿وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلاَّ إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا﴾

۶۸﴿أَفَأَمِنتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لاَتَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا﴾

۶۹﴿أَمْ أَمِنتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لاَتَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا﴾۔

ترجمہ

۶۶۔ تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے دریا میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ وہ تمہارے لیے مہربان ہے۔

۶۷۔ اور جس وقت تمہیں دریا میں کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو اس کے سوا ہر ایک کو بھول جاتے ہو لیکن جس وقت وہ تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہو اور انسان (نعمتوں کا) کفران کرنے والا ہے۔

۶۸۔ کیا تم اس سے مامون ہو کہ وہ خشکی پر (ایک شدید زلزلے کے ذریعے) تمہیں زمین میں دھنسا دے یا تم پر سنگریزوں کا طوفان بھیج دے اور (تمہیں اس میں دفن کردے اور) پھر تمہیں کوئی محافظ (اور مددگار) نہ ملے۔

۶۹۔ یا کیا تم اِس سے مامون ہو کہ وہ پھر تمہیں دریا کی طرف پلٹا دے، تمہاری طرف شدید آندھی بھیج دے اور تمہیں تمہارے کفر کی وجہ سے غرق کردے یہاں تک کہ کسی ایسے شخص کو بھی پیدا نہ کرے کہ جو تمہارے خون کا مطالبہ کرے ۔

نعمتوں کے باوجود کفران کیوں؟

اس سے قبل توحید کے بارے میں شرک کے خلاف بحث ہوچکی ہے۔ زیرِ نظر آیات بھی اس بحث کا تسلسل ہیں۔ ان آیات میں اس موضوع پر دو حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ایک استدلال و برہان کے حوالے سے اور دوسرے وجدان و ضمیر کے حوالے سے۔

پہلا توحیدِ استدلالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار وہ ہے کہ جو دریا میں کشتی کو حرکت عطا کرتا ہے، ایک مسلسل اور دائمی حرکت ﴿رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ﴾۔

واضح ہے کہ دریا یا سمندر میں کشتیوں کے چلنے کے لیے بہت سے باہم پیوستہ نظام موجود ہیں۔ ایک طرف پانی کو مرکب کی طرح پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری طرف بعض چیزوں کا مخصوص وزن پانی سے بہت ہلکا ہے، اس طرح سے کہ وہ پانی کے اوپر رہ سکیں یا پھر انہیں ایسی شکل میں بنایا جاسکتا ہے کہ عملی طور پر ان کا وزن پانی سے کم ہوجائے بلکہ یہاں تک کہ بھاری بوجھ اور بہت سے انسانوں کو اٹھا سکیں۔ تیسری طرف کشتی کو حرکت دینے والی قوت کی ضرورت ہے۔ پُرانے زمانے میں یہ ضرورت منظم ہوائیں پورا کرتی تھیں۔ یہ ہوائیں سمندروں پر ایک خاص نظم کے ساتھ چلتی ہیں۔ ملاح ان سے آشنائی حاصل کرکے ان کے ذریعے بادبانی کشتیوں کو چلاتے ہیں راہوں کو پہنچاننے کے لیے سورج اور ستاروں سے مدد لیتے تھے اور آج کے دور میں قطب نما اور نقشوں سے۔

بہر حال اگر یہ چاروں امور باہم مربوط نہ ہوتے اور کشتیوں کو چلانے کے لیے آپس میں ہم آہنگ نہ ہوتے تو انسان نقل و حمل کے اس انتہائی اہم وسیلے سے محروم ہوتا۔

آپ جانتے ہیں کہ کشتیاں ہمیشہ سے انسان کے لیے نقل و حمل اور آمد و رفت کا ایک انتہائی اہم وسیلہ رہی ہیں۔ آج تو ایسے ایسے بحری جہاز ہیں جو اپنے آپ میں ایک چھوٹے سے شہر کے برابر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ تم فضل خدا سے بہرہ مند ہو ﴿لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِه﴾۔ اپنی آمد و رفت کے لیے، مالِ تجارت کی نقل و حمل کے لیے اور دین و دنیا میں تمہاری مدد کیلئے "کیونکہ پروردگار تم پر مہذبان ہے" ﴿ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾۔

نظام خلقت کے ایک چھوٹے سے گوشے کے حوالے سے یہ توحید استدلالی کے بارے میں بات تھی۔ اس میں خالق کے علم، قدرت اور حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب بات کا رخ استدلال فطری کی طرف مڑتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہیں بھول نہ جانا کہ "جب کبھی تم کسی دریا یا سمندر میں ہوتے ہو اور تمہیں پریشانیاں اور مشکلات آگھیرتی ہیں (اور تم وحشت ناک طوفانی لہروں میں گِھر جاتے ہو)" تو وہ تمام معبود تمہیں بھول جاتے ہیں جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو اور وہی ایک تمہارا سہارا رہ جاتا ہے ﴿وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلاَّ إِيَّاهُ﴾۔ اور ایسے میں انہیں کھوہی جانا چاہیے کیونکہ طوفانی حوادث میں جب تقلید و تعصب کے پردے فطرتِ انسانی کے چہرے سے ہٹتے ہیں تو نور فطرت چمکنے لگتا ہے، وہی نور فطرت کہ جو نورِ توحید، نورِ خدا پرستی اور نورِ یگانہ پرستی ہے۔ جی ہاں! ایسے لمحات میں تمام

تصوراتی و خیالی معبود کہ جنہیں انسانی تو ہم نے وجود بخشا ہوتا ہے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں، اس طرح سے جیسے تیز دھوپ میں برف پانی ہو جاتی ہے ۔

یہ ایک عمومی قانون ہے کہ جس کا تقریباً ہر شخص نے تجربہ کیا ہے کہ مصائب و آلام کی شدت میں جب جان پر بن جاتی ہے، اس وقت تمام ظاہری اسباب بیکار ہو جاتے ہیں اور مادی امداد و ناتوان ہو جاتی ہے ۔ ایسے میں انسان علم و قدرت کے عظیم مبداء کو یاد کرتا ہے کہ جو سخت ترین مشکلات کو حل کرنے پر قادر ہے ۔

ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ اس مبداء کا نام کیا رکھتے ہیں ۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ امید کا ایک دریچہ دل کی طرف کھل جاتا ہے اور ایک لطیف و طاقتور نور دل کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے ۔ انسانی روح و قلب کے اندر خداشناسی کا یہ ایک بہت ہی نزدیک راستہ ہے ۔ [1]

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: لیکن تم ایسے مرد و فراموش ہو کہ "ادھر دست قدرت الٰہی تمہیں ساحل تک پہنچاتا ہے اور ادھر تم اس سے منہ پھیر لیتے ہو اور انسان در اصل ہے ہی کفران کرنے والا ﴿فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا﴾ ۔

ایک بار پھر غرور، غفلت، اندھی تقلید اور تعصب کے پردے اس نور الٰہی کو چھپا دیتے ہیں اور گناہ و نافرمانی کا غبار اور مادی زندگی کی سرگرمیاں اس کا تابناک چہرہ پنہاں کر دیتی ہیں ۔

لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ خدا خشکی اور صحرا میں تمہیں عذاب شدید میں مبتلا نہیں کر سکتا "کیا تم اس سے مامون ہو کہ اس کے حکم سے زمین پھٹ جائے اور تم اس میں دھنس جاؤ" ﴿أَفَأَمِنتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ﴾ ۔ اور کیا تم اس سے مامون ہو کہ تم پر پتھروں کی بارش ہو اور تم پتھروں کے نیچے دفن ہو جاؤ (جبکہ یہ ایسا عذاب ہے کہ جو غرقاب ہونے سے کئی گنا سخت تر ہے) اور پھر تمہیں کوئی محافظ و نگہبان بھی نہ ملے

﴿أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا﴾ ۔

صحرا نورد اس بات سے خاص طور پر آشنا تھے کہ کبھی کبھی بیابان میں ایسے طوفان آتے ہیں کہ ریت اور سنگریزوں کے انبار اٹھائے ہوتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے نئے ٹیلے بن جاتے ہیں اور بعض اوقات تو اونٹوں کی قطار کی قطار ان کے نیچے دفن ہو جاتی ہے ۔ قرآن کی اس دھمکی کو یہ بیابان نورد زیادہ سمجھ سکتے تھے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اے بھول جانے والو! کیا تمہارا خیال ہے یہ تمہرا آخری بحری سفر تھا ”کیا اس سے مامون ہوکہ تمہیں تمہاری ضرورتیں پھر سمندر میں نہ لے جائےں اور وہاں خدا تباہ کن تیز ہواؤں کو حکم دے کہ تمہیں تمہارے کفر اور کفران نعمت کے باعث غرق کردیں اور اس وقت پھر یہ عالم ہوگا کہ کوئی تمہارے خون کا مطالعہ کرنے والا نہ ہوگا، کوئی نہ ہوگا جو کہے کہ ایسا کیوں ہوا“ ﴿أَمْ أَمِنتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَاتَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ کم ظرف انسان:

بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں کہ مشکلات میں تو خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن راحت و آرام میں اسے بھول جاتے ہیں ۔ یہ لوگ حقائق زندگی پر توجہ نہیں دیتے لہٰذا انہیں بھول جانے کی راحت و آرام میں اسے بھول جاتے ہیں ۔ یہ لوگ حقائق زندگی پر توجہ نہیں دیتے لہٰذا انہیں بھول جانے کی عادت پڑچکی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ان کی توجہ خدا اور حقائق زندگی کی طرف ہو تو یہ ان کی ایک استثنائی حالت ہوگی کہ جس کے لیے انتہائی شدید عوامل کی ضرورت ہے ۔ جب تک ان عوامل کے تحت کوئی غیر معمولی صورت حال باقی رہے گی انہیں خدایا درہے گا لیکن جونہی وہ گھڑی ٹلے گی یہ لوگ اپنی انحرافی طبیعت کی طرف پلٹ آئیں گے اور اللہ کو بھول جائیں گے ۔ خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو سنگین و روح فرسا مشکلات میں اللہ کی با عظمت بارگاہ میں سر نہ جھکائیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس اضطراری بیداری اور توجہ کی کوئی قیمت نہیں ۔ صاحبانِ ایمان اور سچے مسلمان وہ ہیں جو راحت و مشکل میں ، سلامتی و بیماری میں ، خوشحالی و قحط میں ، اقتدار و زندان میں ۔ غرض ہر حالت میں اس کی یاد میں رہتے ہیں اور اصولی طور پر حالات کی تبدیلی ان پر ہرگز کوئی اثر نہیں کرتی۔ ان کی روح اس قدر عظیم ہے کہ سب کچھ ان کے اندر سما جاتا ہے جیسے حضرت علی علیہ السلام کی مثال ہے ۔ ان کی عبادت، ان کا زہد اور ان کی دردمندوں کی خبر گیری تخت و اقتدار پر بھی ایسی ہی تھی جیسی گوشہ تنہائی میں تھی، جیسا کہ آپ خود پرہیزگاروں کی صفات کے بارے میں فرماتے ہیں :

”نزلت انفسهم منهم فی البلاء کالتی نزلت فی الرخاء“

خوشی اور غمی میں ان کی ایک سی حالت رہتی ہے ۔ (۲)

مختصر یہ کہ ایمان، توجہ الی اللہ، توسل، عبادت، توبہ اور اللہ کے حضور سر تسلیم خم کی تبھی کوئی قدر و قیمت ہے جب یہ دائمی اور پائداری ہوں۔ باقی رہا موسمی توبہ اور موسمی عبادتیں کہ جو اضطراری حالت میں انجام دی جائیں یا اس حالت میں نکہ جب ذاتی مفادات کا تقاضا ہو تو یہ سب بے فائدہ یا انتہائی کم قیمت ہیں۔آیاتِ قرآنی میں ایسے لوگوں کی بارہا مذمت کی گئی ہے۔

۱۔ توحید فطری کی تفصیل "آفریدگار جہاں" میں مطالعہ کیجئے۔ نیز سورہ نحل کی آیہ ۱۴ کی تفسیر میں بھی ہم اس مسئلے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳-

۲۔ خدا کی حدود حکومت سے فراز ممکن نہیں:

بعض لوگ۔ مثلاً زمانہ جاہلیت کے بت پرست۔ صرف اس وت خدا کی طرف رُخ کرتے تھے جب کسی مشکل میں گرفتار ہوتے تھے۔ مثلاً کبھی وسط سمندر میں طوفان میں گھر جانے پر یا کسی خطرناک گھاٹی پر یا کسی شدید بیماری میں، حالانکہ اگر صحیح طرح سے سوچا جائے تو ہر حالت میں ہر جگہ انسان کے لیے خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔

دریا ہو یا صحرا، سلامتی ہو یا بیماری، ہلاکت کے گھڑے کا سامنا ہو یا کوئی اور موقع۔ در حقیقت سب برابر ہیں۔ ہو سکتا ہے زلزلے کا ایک مختصر سا جھٹکا ہمارے خانہ امن و امان کو وحشت ناک ویرانے میں تبدیل کر دے۔ خون کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہمارے دل کی شہ رگ کو بند کر سکتا ہے۔ دل یا دماغ کے ایک ثانیے کے سکتے کی وجہ سے موت آسکتی ہے۔ ان امور کی طرف توجہ کی جائے تو واضح ہوگا کہ خدا سے غفلت اور اس کی پاک ذات کو فراموش کردینا کس قدر جاہلانہ ہے

۔

وہ لوگ کہ جو اس مفروضے کے حامی ہیں کہ مذہب کی بنیاد خوف ہے، ہوسکتا ہے اس بات کو دستاویز کے طور پر پیش کریں کہ مختلف طبیعی عوامل کا خوف انسان کو خدا کے تصور کی طرف لے جاتا ہے اور ایسے خیالات کو تقویت پہنچاتا ہے

۔

قرآنی آیات نے ایسے اوہام کا جواب دیا ہے کیونکہ قرآن نے خداشناسی کی بنیاد کبھی اس مسئلے پر نہیں رکھی بلکہ اس کی بنیاد نظام خلقت کے مطالعے اور اس مطالعے کے ذریعے اس کی پاک ذات تک پہنچنے کو قرار دیا ہے۔یہاں تک کہ زیر بحث آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ توحید فطری سے پہلے ایمان استدلالی کے بارے میں بات کی گئی ہے اور در حقیقت ان حوادث کو خدا یا دلانے والے شمار کیا گیا ہے نہ کہ اس کی شناحت و معرفت کا موجب کیونکہ حق طلب افراد کے لیے اس کی شناخت و معرفت طریقِ استدلال سے بھی واضح ہے اور راہِ فطرت سے بھی واضح ہے اور راہِ فطرت سے بھی آشکار ہے۔

۳۔ چند الفاظ کا مفہوم:

"یزجی" جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "ازجاء" کے مادہ سے کسی چیز کو مسلسل حرکت دینے کے معنی میں ہے۔

"حاصب"ایسی ہوا کو کہتے ہیں کہ جو سنگریزوں کو اپنے ہمراہ اٹھالائے اور ان کے ٹیلے بنادے ۔ یہ لفظ دراصل "حصباء" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "سنگریزہ"۔

"قاصف"توڑنے والے کے معنی میں ہے ۔یہاں ایسی شدید آندھی کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر چیز کو درہم برہم کرکے رکھ دے ۔

"تبیع""تابع' کے معنی میں ہے ۔یہاں ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے کہ خون یا خونبہا کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑا ہو اور اس کا پیچھا کرے ۔

آیات ۷۲،۷۱،۷۰

۷۰﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِی آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلیٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾

۷۱﴿يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ فَمَنْ أُوتِیَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُوْلٰئِکَ يَقْرَئُونَ كِتَابَهُمْ وَلاَيُظْلَمُونَ فَتِيلًا﴾

۷۲﴿وَمَنْ كَانَ فِی هٰذِهِ أَعْمَی فَهُوَ فِی الْآخِرَةِ أَعْمَی وَأَضَلُّ سَبِيلًا﴾

ترجمہ

۷۰۔ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی و دریا میں انہیں سواریاں عطا کیں، طرح طرح کے پاکیزہ رزق میں سے انہیں روزی دی اور انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی۔

۷۱۔ وہ دن یاد کرو کہ جب ہر گروہ کو ہم اس کے امام کے ساتھ پکاریں گے۔ پس جس کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں ہوگا وہ اسے (بڑی مسرت سے)بڑھیں گے اور ان پر رائی برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔

۷۲۔ لیکن وہ لوگ جو اس دنیا میں (چہرہ حق کو دیکھ کر بھی) اندھے بنے رہے وہ وہاں بھی اندھے رہیں گے بلکہ گمراہ تر۔

انسان گلشن حیات کا بہترین پھول

تربیت وہدایت کا ایک طریقہ یہ ہے لوگوں کو ان کی عظمت اور مقام یاد دلایا جائے۔ قرآن مجید بھی یہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ گزشتہ آیات میں مشرکین اور منحرف افراد کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب زیر نظر آیات میں نوعِ انسانی کے بلند مقام کا تذکرہ ہے نیز اس عطا ہونے والی نعمات الٰہی کا بیان ہے تا کہ وہ اپنے اس انتہائی اعلیٰ مقام کی طرف توجہ کرے اور اپنے مقامِ گراں بہا کو ضائع نہ کردے اور اپنے تیں کسی حقیر سی قیمت پر نہ بیچ ڈالے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اولادآدم کو عزت وتکریم بخشی اور گرامی قدر بنایا ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِی آدَمَ﴾۔

اس کے بعد انسان کو عطا ہونے والی تین طرح کی نعمات الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی نعمت:

”ہم نے انہیں خشکی ودریا میں سواریاں عطا ہیں“ ﴿وَحَمَلْنَاهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾۔

دوسری نعمت:

"پاکیزہ رزق میں سے ہم نے انہیں روزی دی ہے" ﴿وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ﴾)

لفظ "طیب" کے مفہوم میں ہر پاکیزہ موجود شامل ہے۔ اس مفہوم پر توجہ کی جائے تو اس عظیم خدائی نعمت کی وسعت واضح ہو جاتی ہے۔

تیسری نعمت:

"ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی ہے" ﴿وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ سواری۔ انسان کے لیے اولین نعمت:

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا کی ہیں ان میں سے سب سے پہلے خشکی اور دریا میں اس کی آمد ورفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ اس بناء پر ہو کہ طیبات اور مختلف قسم کے رزق سے حرکت اور سفر کے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہیں اور صفحہ زمین پر اس سفر کے لیے انسان کو سواری کی ضرورت ہے۔ یہ بجا کہا جاتا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔

یا پھر اس بناء پر ہے کہ خدا تعالیٰ اس زمین پر انسانی حکمرانی کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ دریا ہو یا صحرا انسان کا اقتدار موجود ہے۔ اس زمین پر دیگر موجود کا تسلط محدود اور ایک حصے پر ہے۔ یہ صرف انسان ہے جو پورے کرہ خاکی پر حکومت کرتا ہے۔ دریا، صحرا، اونچائی، اترائی اور ہوا سب میں انسان کی حکومت ہے۔

۲۔ خدا کی طرف سے انسان کی عزت و تکریم:

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو عزت بخشی۔ یہ ایک سربستہ سی بات ہے۔ اللہ نے انسان کو کس چیز سے عزت بخشی اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس اعطاء سے مراد عقل و نطق کی قوت، مختلف استعدادیں اور ارادے کی آزادی ہے۔

بعض سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کی موزوں جسامت اور قامتِ راست ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس اعطاء سے انگلیاں مراد ہیں جن کے ذریعے انسان بہت سے ظریف اور دقیق کام انجام دے سکتا ہے اور اسی طرح لکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس سے انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تقریباً واحد موجود ہے جو اپنی غذا اپنے ہاتھ سے کھا سکتا ہے۔

بعض سمجھتے ہیں کہ یہ انسان کی اس سربلندی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ روئے زمین کی تمام موجودات پر تسلط رکھتا ہے

۔

بعض کا خیال ہے کہ اس عطاء کی طرف اشارہ ہے کہ انسان معرفت الٰہی پر اور اس کے فرمان کی اطاعت پر قدرت رکھتا ہے۔

لیکن یہ واضح ہے کہ یہ سب نعمتیں انسان میں جمع ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے متضاد نہیں ہے۔

لہٰذا اس عظیم مخلوق کو خدا نے جو گرامی قدر بنایا اور عزت عطا کی ہے وہ ان تمام نعمات اور ان کے علاوہ دیگر نعمات کی بنیاد پر ہے۔ مختصر یہ کہ انسان دیگر مخلوقات پر بہت سے امتیازات رکھتا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بلند تر اور جاذب نظر زیادہ ہے۔

انسان کے جسمانی امتیازات کے علاوہ انسان ایسی روح کا حامل ہے جو کمال حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ صلاحتیں اور بہت توانائی رکھتی ہے۔

۳۔ "کرّمنا" اور "فضّلنا" میں فرق:

اس سلسلے میں مختلف نظریات بیان کیے گئے ہیں:

بعض کا کہنا ہے کہ "کرّمنا" ان نعمات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذاتاً انسان کو دی ہیں جبکہ "فضّلنا" ان فضائل کی طرف اشارہ ہے جو انسان نے توفیق الٰہی سے کسب کیے ہیں۔

یہ احتمال بھی بہت صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "کرّمنا" مادی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو اور "فضّلنا" روحانی پہلوؤں کی طرف کیونکہ لفظ "فضّلنا" عام طور پر قرآن میں اسی معنی میں آیا ہے۔

۴۔ آیت میں "کثیر" کا مفہوم

بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ زیرِ بحث آیت تمام اولادِ آدم پر فرشتوں کی برتری کی دلیل ہے، وہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن اس آیت میں کہتا ہے کہ ہم نے انسانوں کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت وبرتری عطا کی ہے، لہٰذا اس کا واضح مطلب ہے کہ ایک گروہ ایسا ہے کہ جس سے انسان افضل نہیں ہے اور یہ گروہ فرشتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

لیکن خلقتِ آدم اور فرشتوں کا ان کے سامنے سجدہ وخضوع کرنے اور آدم (ص) کی طرف سے انھیں علمِ اسماء کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے تو اس امر میں شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ انسان فرشتوں سے افضل وبرتر ہے لہٰذا "کثیر" یہاں پر "جمیع" کے معنی میں ہوگا۔
عظیم مفسّر طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ قرآن میں عرب محاورات میں بہت معمول ہے کہ یہ لفظ "جمیع" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ طبرسی کہتے ہیں کہ اس جملے کا معنی یہ گا:

"﴿انّا فضلناهم علیٰ من خلقنا وهم كثير﴾"

ہم نے انسان کو ان سب پر فضیلت عطا کی ہے جنھیں ہم نے پیدا کیا ہے اور یہ مخلوقات کثیر ہیں۔

شیاطین کے بارے میں قرآن کہتا ہے:﴿وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ﴾ (شعراء/۲۲۳)

واضح ہے کہ شیطان تو سب جھوٹے ہیں نہ کہ ان میں سے اکثر۔

بہرحال اس معنی کو خلاف ظاہر سمجھیں تو خلقتِ انسان کے بارے میں موجود آیات ہماری مذکورہ بات کے لئے واضح قرینہ ہیں۔

۵۔ انسان کیوں افضل ہے؟

اس سوال کا جواب کوئی پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان ہی وہ واحد موجود ہے جس میں مختلف مادی ومعنوی اور جسمانی وروحانی قوتیں اور توانائیاں موجودہیں ،یہی انسان متضادچیزوں میں رہ کرپرورش پاسکتا ہے، صرف انسان ہی ہے جو کمال وارتقاء اورپیشرفت کی لامحدود صلاحیت رکھتا ہے

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ایک حدیث بھی اس مدعا پر ایک گواہ ہے آپ (ص) فرماتے ہیں :

اللہ نے عالم کو تین قسم کا پیدا کیا ہے: فرشتے، حیوان اور انسان۔ فرشتے عقل رکھتے ہیں اور ان میں شہوت وغضب کی قوت نہیں ہے۔ حیوان شہوت وغضب کا مجموعہ ہیں لیکن انسان دونوں کا مجموعہ ہے تاکہ معلوم ہوکہ کونسی قوت غالب آتی ہے۔ اگر اس کی عقل شہوت پر غالب آجائے تو یہ فرشتوں سے افضل ہے اور اگر اس کی شہوت اس کی عقل پر غالب آجائے تو یہ حیوانات سے پست تر ہے۔ (۱)

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ تمام انسان فرشتوں سے افضل ہیں جبکہ بہت سے لوگ بے ایمان، شریر اور ستمگر ہیں اور ایسے لوگ مخلوقِ خدا میں سے پست ترین شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کیا زیرِ بحث آیت میں لفظ "بنی آدم" سب انسانوں کے لئے ہے یا ان میں سے صرف ایک گروہ کے لئے۔

اس سوال کا جواب ایک جملے میں دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ:

جی ہاں! تمام انسان برتر ہیں لیکن بالقوۃ واستعداد کے لحاظ سے۔ یعنی سب یہ مقام اور اہلیت رکھتے ہیں، البتہ اس سے استفادہ نہ کریں اور اپنے مقام سے گرجائیں تو یہ کام خود ان سے مربوط ہے۔

انسان کی تمام موجودات پر برتری اگرچہ روحانی اور انسانی حوالے سے ہے تاہم نامناسب نہیں کہ ہم علماء کے بقول بعض حوالوں سے جسمانی قوت کے لحاظ سے بھی افضل جانیں۔ (اگرچہ بعض پہلوؤں سے انسان کمزور نظر آتا ہے)۔

کتاب "انسان موجود ناشناختہ" کا مؤلف الیکسر کارل کہتا ہے:

انسانی بدن غیر معمولی استحکام ار قابلیت کا حامل ہے، یہ ہر قسم کے حادثے میں استقامت دکھاتا ہے، اسی طرح بھوک، بے خوابی، تکان، بہت زیادہ غصّے، درد، بیماری، دُکھ، مشقّت اور روح وبدن میں موجود حیرت انگیز اعتدال کی حفاظت کے موقع بہت عجیب وغریب فکری وجسمانی توانائی کی وجہ سے وہ صنعت وتمدن میں اس مقام پر آپہنچا ہے اور تمام جانداروں پر اپنی برتری ثابت کرچکا ہے۔ [۲]

اگلی آیت میں انسان کے لئے ایک اور خدائی نعمت کی طرف اشارہ ہے، نیز اس نعمت کے بعد انسان پر جو سنگین ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

پہلے مسئلہ رہبری اور انسانی سرنوشت میں اس کی تاثیر کو بیان گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام اور رہبر کے ساتھ پکاریں گے ﴿يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ﴾۔

یعنی وہ لوگ کہ جنھوں نے ہر زمانے میں انبیاء اور ان کے اوصیاء کی رہبری کو قبول کیا ہے اپنے ان پیشواؤں کے ساتھ ہوں گے اور جنھوں نے شیطان، آئمہ ضلال اور جابر وظالم پیشواؤں کی رہبری کو اختیار کیا ہے وہ ان کے ساتھ محشور ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ رہبری اور پیروی کا جو رشتہ اس جہان میں ہوگا وہ پوری طرح اُس جہان میں منعکس ہوگا۔ اسی بنیاد پر اہلِ نجات اور اہلِ عذاب ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں گے۔

اگرچہ بعض مفسّرین نے چاہا ہے کہ یہاں "امام" کا وسیع مفہوم ہے اور اسی میں ہر پیشوا شامل ہے چاہے وہ انبیاء ہوں یا آئمہ ہدیٰ یا علماء اور کتاب وسنت اور اسی طرح آئمہ کفر وضلال بھی لہٰذا وہاں ہر شخص اس رہبر کی صف میں ہوگا جس کا یہاں طریقہ اپنایا ہوگا ۔

انسان کے کمال وارتقاء کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعبیر سب انسانوں کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے اور اسے خبردار کرتی ہے کہ رہبر کے انتخاب میں بہت زیادہ غور وفکر سے کام لے اور اپنی فکر و نظر اور زندگی کی مہار ہر کسی کے سپرد نہ کردے ۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہاں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہوجائیں گے "جن کا نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ افتخار اور سرور کے ساتھ اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ ہوگا" ﴿فَمَنْ أُوتِیَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُوْلٰئِکَ يَقْرَئُونَ كِتَابَهُمْ وَلَايُظْلَمُونَ فَتِيلًا﴾ ۔ (۳)

"لیکن جو لوگ اس جہاں میں کوردل تھے وہ آخرت میں بھی اندھے ہوں گے" ﴿وَمَنْ كَانَ فِی هٰذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِی الْآخِرَةِ أَعْمَى﴾ ۔ اور فطری امر ہے کہ دل کے یہ اندھے سب سے زیادہ گمراہ ہوں گے ﴿وَأَضَلُّ سَبِيلًا﴾ ۔ وہ نہ اس دنیا میں راہِ ہدایت پائیں گے اور نہ آخرت میں بہشت و سعادت کی راہ۔ کیونکہ انہوں نے خود سے اپنی آنکھیں تمام حقائق کے سامنے بند کررکھی ہیں ۔ انہوں نے حق کا چہرہ دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ کھولیں ۔ آیات خدا اور جو کچھ باعث ہدایت و عبرت تھا اس سے آنکھیں چرائے رکھیں اور خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے انہوں نے اپنے آپ کو محروم رکھا اور دارِ آخرت چونکہ اس جہاں کا عکس العمل ہے تو کیا تعجب کی بات ہے کہ یہ کوردل وہاں عرصہ محشر میں نابینوں کی صورت میں پیش ہوں ۔

چند قابل توجہ نکات

۱ ۔ انسان زندگی پر رہبری کا اثر:

انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو رہبری کے مسئلے سے جدا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کسی بھی گروہ کے حقیقی راستے کو واضح کرنے کے لیے ہمیشہ رہبر اور پیشوا کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اصولی طور پر کمال و ارتقاء وجود رہبر کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ انبیاء اور اوصیاء کے بھیجے جانے اور انتخاب کا یہی راز ہے ۔

علم عقائد و کلام میں بھی قاعدہ لطف سے استفادہ کرتے ہوئے اور معاشرے کے نظم و نسق کے حصول اور انحراف سے بچانے میں رہبر کی ضرورت کے حوالے سے بعثت انبیاء اور ہر زمانے میں موجود امام کا ضروری ہونا ثابت کیا گیا ہے لیکن ایک خدائی رہبر اور عالم و صالح انسان کی رہبری انسان کے لیے اصلی ہدف تک رسائی کو جیسے آسان اور تیز تر کردیتی ہے ایسے ہی آئمہ کفر و ضلال کی رہبری کو قبول کرنے سے انسان بد بختی اور بد انجام کے گڑھے میں جاگرتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں معتدد احادیثِ اسلامی مصادر میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعے سے مفہوم آیت اور ہدف امامت واضح ہوجاتا ہے۔

ایک حدیث شیعہ اور سنی حضرات نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس میں ہے کہ امام نے اپنے آباؤ اجداد کے واسطے سے رسولِ اکرم سے اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا:

"یدعی کل اناس بامام زمانھم و کتاب ربھم وسنة نبیھم"

اس روز ہر قوم کو اس کے زمانے کے امام، اس کی کتاب الٰہی اور اس کے پیغمبر کی سنت کے ساتھ پکارا جائے گا۔ (۴)

۱۔ نورالثقلین، ج۳، ص۱۸۸۔

۲۔ "انسان موجودِناشناختہ"، ص۷۳ و ۷۴۔

۳۔ "فتیل" اس باریک اور نازک تار کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف کے اندر ہوتی ہے۔ جبکہ کھجور کی گٹھلی کی پشت پر جو تار ہوتی ہے اسے "نقیر" کہتے ہیں جبکہ "قطمیر" اس سے نازک چھلکے کو کہتے ہیں جس نے کھجور کی گٹھلی کو چھپا رکھا ہوتا ہے اور یہ تمام الفاظ بہت چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے کنائے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

۴۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

فہرست

سورہ بنی اسرائیل........ ۴
نام اور مقام نزول........ ۴
فضیلت........ ۵
مضامین ایک نگاہ میں........ ۵
آیت ۱........ ۷
معراجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم........ ۷
مسئلہ معراج........ ۹
۱۔ معراج۔ قرآن و حدیث کی نظر میں:........ ۱۰
معراج جسمانی تھی یا روحانی؟........ ۱۳
معراج کا مقصد........ ۱۵
معراج اور دور حاضر کا علم اور سائنس........ ۱۶
آیات ۸،۷،۶،۵،۴،۳،۲........ ۱۹
دو عظیم طوفانی واقعات........ ۲۰
چند اہم نکات........ ۲۳
۱۔ بنی اسرائیل کے دو تاریخی فسادات:........ ۲۳
۲۔ جو کام بھی کرو گے اپنے ساتھ ہی کرو گے:........ ۲۷
۳۔ آیات کی تطبیق اسلامی تاریخ پر:........ ۲۹
سعادت کا بالکل سیدھا راستہ........ ۳۰

یہ قرآن عبادت میں بھی افراط و تفریط سے بچاتا ہے۔ ۳۰
چند اہم نکات.................... ۳۶
۱۔ کیا انسان ذاتی طور پر جلد باز ہے ؟ ۳۶
۲۔ جلد بازی۔ ایک مصیبت: ۳۷
۳۔ کائنات میں نظم و حساب کا انسانی زندگی پر اثر: ۳۹
آیات ۱۳،۱۴،۱۵.................... ۴۰
چادر اہم اسلامی اصول.................... ۴۰
چند اہم نکات.................... ۴۵
۱۔ اچھی اور بری فال: ۴۵
۲۔ انسان کا عجیب اعمال نامہ: ۴۶
۳۔ گنگار کے ساتھ بے گناہ نہیں جلے گا: ۴۷
۴۔ برائت کا اصول اور آیت "﴿ما کنا معذبین﴾": ۴۸
آیات ۱۶،۱۷ .... ۴۹
عذاب الٰہی کے چارہ مرحلے ۴۹
آیات ۱۸،۱۹،۲۰،۲۱ .... ۵۲
طالبان دنیا اور طالبان آخرت.................... ۵۲
چند اہم نکات.................... ۵۶
۱۔ کیا دنیا و آخرت میں تضاد ہے؟: ۵۶
۲۔ کامیابی میں کوشش کا دخل: ۵۸
۳۔ امداد الٰہی: ۵۸

آیات ۲۵،۲۴،۲۳،۲۲ .... ۵۹
اہم اسلامی احکام کا سلسلہ........ ۵۹
توحید اور ماں باپ سے حسن سلوک ۵۹
ماں باپ کا انتہائی احترام........ ۶۳
چند اہم نکات........ ۶۵
۱۔ منطقِ اسلام میں والدین کا احترام: ۶۵
۲۔ "قضاء" کے معنی کے بارے میں تحقیق: ۶۷
۳۔ "اف" کے معنی کی تحقیق: ۶۹
آیات ۲۹،۲۸،۲۷،۲۶ .... ۷۱
انفاق و بخشش میں اعتدال ۷۱
چند اہم نکات........ ۷۸
۱۔ "ذی القربیٰ" سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟ ۷۸
۲۔اسراف کے بُرے اثرات : ۷۹
۳۔ "اسراف" اور "تبذیر" میں فرق : ۸۰
۴۔کیا میانہ روی ایثار کے منافی ہے : ۸۲
آیات ۳۵،۳۴،۳۳،۳۲،۳۱ .... ۸۳
چھ اہم احکام........ ۸۳
زنا کا فلسفہ حرمت ۸۶
چند اہم نکات........ ۹۳
۱۔ کم فروشی کا نقصان: ۹۳

۲۔ کم تولنے کے مفہوم کی وسعت:...................................... ۹۴
۳۔ "قسطاس" کا مفہوم:...................................... ۹۴
آیات ۳۶،۳۷،۳۸،۳۹،۴۰...................................... ۹۶
تفسیر...................................... ۹۶
۱۔ صرف علم کی پیروی کرو :...................................... ۹۶
نظم معاشرہ کے لیے ایک اہم درس...................................... ۹۸
گمان کی طرف میلان کا سدِّ باب...................................... ۱۰۰
۲۔ متکبر نہ بنو...................................... ۱۰۱
۳۔ مشرک نہ بنو...................................... ۱۰۳
آیات ۴۱،۴۲،۴۳،۴۴...................................... ۱۰۶
وہ حق سے کیونکر فرار کرتے ہیں ؟...................................... ۱۰۶
دلیل تمانع...................................... ۱۰۷
موجودات عالم کی عمومی تسبیح...................................... ۱۱۱
ایک سوال کا جواب...................................... ۱۱۵
اھل بیت (ص) سے چند روایات...................................... ۱۱۶
آیات ۴۴،۴۵،۴۶،۴۷...................................... ۱۱۸
شان نزول...................................... ۱۱۸
جاہل مغرور...................................... ۱۲۰
چند اہم نکات...................................... ۱۲۱
۱۔ ان آیات کا مجموعی جائزہ:...................................... ۱۲۱

۲۔ خدا کی طرف نسبت کا مفہوم: ۱۲۲
۳۔ حجاب مستور کیا ہے؟: ۱۲۳
۴۔ "اکنہ" اور "وقر" کیا چیز ہے؟ ۱۲۵
۵۔ "﴿ما یستمعون به﴾" کی تفسیر ۱۲۵
۶۔ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "مسحور" کیوں کہتے تھے؟ ۱۲۵
۷۔ توحید کی آواز پر مشرکین کا خوف ۱۲۶
آیات ۴۹،۵۰،۵۱،۵۲ .... ۱۲۷
قیامت یقینی ہے ۱۲۷
آیات ۵۳،۵۴،۵۵،۵۶،۵۷ .... ۱۳۱
تمام مخلفین سے منطقی طرزِ عمل ۱۳۱
"وسیلہ" کیا ہے؟ ۱۳۹
آیات ۵۸،۵۹،۶۰ .... ۱۴۰
بہانہ سازوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرو ۱۴۰
چند اہم نکات ۱۴۲
۱۔ رسول اللہ کا خواب اور شجرہ ملعونہ: ۱۴۲
۲۔ منکرینِ اعجاز کی عذر تراشیاں ۱۴۷
۳۔ گزشتہ لوگوں کے انکار کا آئندہ لوگوں سے تعلق؟ ۱۴۸
آیات ۶۱،۶۲،۶۳،۶۴،۶۵ .... ۱۴۹
شیطان کے جال ۱۴۹
چند اہم نکات ۱۵۳

۱۔ چند الفاظ کا مفہوم:.. ۱۵۳

۲۔ وسوسے کے لیے شیطانی ذرائع: ۱۵۳

الف۔ شیطانی کا پہلا ہتکھنڈا پراپیگنڈا ہے:.. ۱۵۴

ب۔ شیطان کا دوسرا ہتھکنڈا فوجی قوت کا استعمال ہے:.. ۱۵۴

ج۔ اقتصادی ہتھکنڈا:.. ۱۵۵

د۔ نفسانی تباہی کے شیطانی پروگرام:.. ۱۵۷

۳۔ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟:.. ۱۵۷

آیات ۶۶،۶۷،۶۸،۶۹ .... ۱۵۸

نعمتوں کے باوجود کفران کیوں ؟.. ۱۵۸

چند اہم نکات.. ۱۶۱

۱۔ کم ظرف انسان:.. ۱۶۱

۲۔ خدا کی حدود حکومت سے فراز ممکن نہیں :.. ۱۶۳

۳۔ چند الفاظ کا مفہوم:.. ۱۶۳

آیات ۷۰،۷۱،۷۲.. ۱۶۵

انسان گلشن حیات کا بہترین پھول.. ۱۶۵

پہلی نعمت : ۱۶۵

دوسری نعمت:.. ۱۶۵

تیسری نعمت :.. ۱۶۶

چند اہم نکات.. ۱۶۶

۱۔ سواری ۔انسان کے لیے اولین نعمت : ۱۶۶

۲۔ خدا کی طرف سے انسان کی عزت و تکریم:.................... ۱۶۶
۳۔ "کرّمنا" اور "فضّلنا" میں فرق:.................... ۱۶۷
۴۔ آیت میں "کثیر" کا مفہوم.................... ۱۶۷
۵۔ انسان کیوں افضل ہے؟.................... ۱۶۸
چند قابل توجہ نکات.................... ۱۷۰
۱۔ انسان زندگی پر رہبری کا اثر:.................... ۱۷۰